نگار

مجلۂ علمیہ و ادبیہ

رئیس التحریر

نیاز فتحپوری

مجلۂ نگار کے دو شعبے

۱- **شعبۂ ترتیب**:- اِس شعبہ سے جو مراسلت کیجائے (جسمیں رسائل و اخبارات کا تبادلہ، ترسیل مضامین اور تمام وہ مکتوبات شامل ہیں، جنکا تعلق اڈیٹر سے ہے)

اس میں براہ کرم یہ پتہ تحریر فرمائیے۔

حضرة نیاز فتحپوری۔ بھوپال

۲- **شعبۂ نشر و انتظام**:- اِس شعبہ سے جو خطاب کیا جائیگا (جسمیں ترسیل زر، درخواست خریداری، مضامین، اشتہار وغیرہ شامل ہیں) اسکا پتہ یہ ہوگا۔

حافظ امام الدین۔ منٹولہ۔ آگرہ۔

لطیف الدین احمد

رئیس شرکت (ڈائرکٹر کمپنی)

اُجرت نامۂ اشتہار رسالۂ نگار

تعداد طبع	ایک صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
۱۲	۶۰	للعہ ۴۰	عنہ ۲۰
۹	۳۶	للعہ ۲۴	عہ ۱۲
۶	للعہ ۲۴	عہ ۱۶	مے ۸
۳	عہ ۱۲	مے ۸	للعہ
۱	ے ۸	للعہ	عاعہ
پیشگی اجرت اشتہار لیجائے گی	معاہدۂ اشتہار منسوخ نہیں ہو سکتا	مدت معینہ کے اندر مضمون اشتہار بدلا نہیں جا سکتا	کسی اشتہار کا چربہ منظور نہیں کیا جائیگا

ٹائیٹل کے اشتہارات کی اُجرت نرخ نامہ سے ۲۵ فیصدی زاید ہوگی۔

نگار

(۱) ہر انگریزی مہینہ کے تیسرے ہفتہ میں شائع ہو جائیگا، اسلئے اگر ۳۰ تک نہ پہونچے، تو ہمیں مطلع فرمائیے۔

(۲) چونکہ اک مشترکہ سرمایہ سے جاری ہوتا ہے، اسلئے مالی مشکلات کی وجہ سے اسکے بند ہونیکا خیال دل میں نہ لائیے۔

(۳) پانچ روپیہ میں ایک سال تک، تین روپیہ میں چھ ماہ تک آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہیگا۔ اس سے کم مدت کے لئے درخواست خریداری آپکی شان کے منافی ہے، اسلئے ہم بھی اسکی تعمیل سے احتراز کرینگے۔

(۴) پیشگی قیمت روانہ کرنیکا مشورہ آپ کو دینا ہے، کیونکہ وی۔ پی میں آپ کا نقصان ہے، جو ہمیں کسیطرح گوارا نہیں ہو سکتا، البتہ اگر آپ چاہیں تو ہر ماہ آنے کے ٹکٹ بھیجکر رسالہ حاصل کر سکتے ہیں۔

(منیجر نگار۔ آگرہ)

نگار

رئیس التحریر: نیاز فتحپوری

معاون مدیر: مخمور اکبر آبادی

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۰۱۱

مجلد ۱ شمارہ ۲	رجب سنہ ۱۳۴۰ھ مارچ سنہ ۱۹۲۲ء	قیمت سالانہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

فہرست

علم و ادب

خوشنویسیت	نیاز فتحپوری	۱-۸
غزل	حضرت سہا، علیگ	۸
لالہ رخ	لطیف الدین احمد	۹-۳۴
غزل فارسی	غالب مغفور	۳۴
تخمیس کلام غالب	سید کلب احمد، ثانی جائسی	۳۵-۳۶
آرزو	سید محمد محمود رضوی بی۔ اے مخمور اکبرآبادی	۳۶
علوم اسلامی پر ایک مورخانہ نظر۔	نیاز فتحپوری	۳۷-۵۰
مغرب میں اخبار کیونکر مرتب ہوتا ہے	نیاز فتحپوری	۵۱-۵۶
خانقاہ کا قیدی (فسانہ)	قمر الحسن، قمر	۵۷-۶۲

عنترہ بن شداد	ابوالمحاسن مولوی محمود علی	۶۳ - ۷۰
سحر بنگالہ (نظم)	سید محمد محمود رضوی بی۔ اے مخمور اکبرآبادی	۷۱ - ۷۲
غزل فارسی	نیاز فتحپوری	۷۲
معلومات		
ہوائے منضغط۔ ریڈیم اور پلوٹونیم	نیاز فتحپوری	۷۳ - ۷۷
یارانِ نجد	نیاز فتحپوری	۷۸
انتقاد	نیاز فتحپوری	۷۹ - ۸۰

ازراہ کرم۔ مضامین، و رسائل تبادلہ، حضرت نیاز فتحپوری کے نام بھوپال کے پتہ پر ارسال فرمائیے۔
ترسیل زر و مراسلت خریداری بنام منیجر نگار منٹولہ اگرہ ہونی چاہیئے۔
مراسلت میں اپنا نام و پتہ خوش خط تحریر فرمائیے۔

نگار

رئیس التحریر نیاز فتحپوری

معاون مدیر مخمور اکبرآبادی، بی۔ اے

مجلد ۱ شمار ۲	مارچ سنہ ۱۹۲۲ء، رجب سنہ ۱۳۴۰ھ	قیمت سالانہ پانچ روپیہ قیمت ایک پرچہ آٹھ آنے

فوضویّت

انارکزم Anarchism

(از: نیاز فتحپوری)

فوضویّت یا انارکزم کا مفہوم یہ ہے کہ افراد انسانی اس طرح زندگی بسر کریں، کہ اُن پر کسی حکمراں جماعت کا تسلط و اقتدار قایم نہ ہو، لیکن یہاں فوضویّت سے مقصود اک خاص "اجتماعی مذہب" ہے، جو چند علمی نظریات ([illegible]) کی بنا پر قایم ہے۔ ممکن ہے کہ یہ نظریات صحیح نہ ہوں، لیکن ان سے ان کے مخترعین کی وسعتِ نظر و جدّت پسندی ضرور ثابت ہوتی ہے۔

فوضویت، جسے انگریزی میں انارکزم کہتے ہیں، اپنی تاریخ کے لحاظ سے قدیم ہو یا جدید، لیکن اس میں شک نہیں کہ متاخرین میں اسکا سب سے بڑا حامی، کروپٹکین تھا، اور چونکہ اسکا مذہب،

متانت و علمی سنجیدگی سے زیادہ قریب ہے، اس لئے مختصراً اس کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہوگا۔

کروپٹکن کون تھا؟

یہ بہ مقام ماسکو، ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوا۔ ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۸ء تک فوجی افسر رہا، پھر پیٹروگراڈ میں آکر ۱۸۷۱ء تک اس نے ریاضیات کا مطالعہ کیا (اسی زمانہ میں وہ جمعیت جغرافی کا سیکرٹری بھی تھا)، اس کے بعد ۱۸۷۲ء میں بلجیم پہونچکر، مزدوری پیشہ جماعت کا ممبر بن گیا اور اسی سال پیٹروگراڈ واپس آکر، اک خُفیہ انجمن کا رُکن ہوگیا۔

حکومت کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو اسے گرفتار کرلیا لیکن ۱۸۷۶ء میں وہ کسی طرح جیل سے بھاگ کر انگلستان پہونچا، لیکن دوسرے سال وہ سوئیٹزرلینڈ چلا گیا اور یہاں ۱۸۸۱ء تک مقیم رہا، جب وہ یہاں سے بھی نکالا گیا تو پھر وہ فرانس و انگلستان کے مختلف مقامات میں پھرتا رہا اور ۱۸۸۳ء میں حکومتِ فرانس نے اسے اس الزام پر گرفتار کرلیا کہ اسکا تعلق کسی خفیہ انجمن سے تھا۔ جب ۱۸۸۶ء میں وہ آزاد ہوا، تو پھر انگلستان آگیا اور یہیں اپنی سکونت اختیار کرلی۔

کروپٹکن کے اجتماعی خیالات کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) اساس مذہب (۲) قوانین کے متعلق اس کی رائے (۳) سلطنت یا حکومت کے متعلق اس کا مذہب (۴) ملکیت یا سرمایہ دار جماعت کی نسبت اس کا خیال۔

اساس مذہب

اس کا خیال ہے کہ انسان (یعنی اجتماعِ انسانی) کی غایت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ترقی کرتا رہے اور اس کا مستقبل، ماضی سے زیادہ شاندار اور روشن نظر آئے۔ اس نے اپنے مذہب کی بنیاد، نظریہ تحوّل یا نشو و ارتقا پر قایم کی ہے، یعنی انسان بھی تمام زندہ یا جامد مخلوقات کی طرح اک دائمی تحوّل و ارتقا کی حالت سے گذر رہا ہے۔

اس کا اعتقاد تھا کہ (۱) ارتقار انسانی کی رفتار اکثر تدریجی ہوتی ہے، لیکن بعض وقت ایک فوری تغیّر اور ناگہانی انقلاب بھی نظامِ بشری میں پیدا ہوجاتا ہے۔

(۲) ہرچند بشریت کا موجودہ نظام، چند اجتماعی قوتوں کے توازن و تناسب کا نتیجہ ہے، لیکن اگر ان مجتمعہ قوتوں میں سے، کوئی قوت علیحدہ ہوجائے، تو باقی ماندہ قوتیں کام جاری رکھتی ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ یہ متفقہ اجتماع، نظامِ بشری میں اک انقلابِ عظیم برپا کردیتا ہے، جس سے مقصود اُس

فوت شدہ توازن کا اعادہ ہوتا ہے۔

(۳) چونکہ بشریت کی راہِ عمل اور حصولِ مقاصد میں بہت سے موانع پیش آتے ہیں، اس لئے وہ مُصلحین، جو انسانیت کو اس کے مقصودِ حقیقی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں، اُن موانع کا سخت مقابلہ کرتے ہیں اور اپنے مرکز کو نہیں چھوڑتے۔

پھر چونکہ موجودہ سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی نظام، ارتقارِ بشری کے بالکل منافی ہے، اس لئے وہ کہتا تھا کہ وہ وقت بالکل قریب ہے جب دُنیا میں ناگہانی انقلابات پیدا ہوں اور بشریت کو دَورِ جمود سے نکال کر ایک روشن مستقبل کی شاہراہ پر لگادیں۔

قوانین کے متعلق اس کی رائے

اس مسئلہ میں اس کا خیال تھا کہ ارتقارِ بشری کا تقاضہ ہے کہ موجودہ قوانین کو باطل کردیا جائے، کیونکہ یہ قوانین اجتماعِ بشری کو مراتب ارتقار حاصل کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ ہر چند ان قوانین میں اصحابِ املاک کے ساتھ اجتماعِ بشری کی بھی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، لیکن اصحابِ املاک کے ساتھ جس رواداری کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، وہ جمہور کے لئے سخت نقصان رساں ہے۔

ان قوانین کا مقصد صرف یہ ہے کہ اصحابِ املاک اور سرمایہ داروں کا تسلط، جمہور پر قایم رکھا جائے یہی وجہ ہے کہ بشریت، بجائے ارتقار کے صرف ایک مرکز پر قایم نظر آتی ہے۔ اگر ان قوانین پر غور کیا جائے، جن کے آگے انسان سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہے، تو ان کی تین قسمیں نظر آئیں گی:۔

(۱) وہ قوانین جو ملکیت کے حامی ہیں۔ (۲) وہ قوانین جو حکومت کے معاون ہیں، اور (۳) وہ قوانین جو افراد کی حمایت کرتے ہیں ——— لیکن جب ان اقسام کی تحلیل کی جاتی ہے تو نتیجہ وہی ایک نکلتا ہے کہ "نظامِ بشری کو ان سے سخت نقصان پہونچ رہا ہے"۔

پہلی قسم کی غایت یہ ہے کہ مزدوروں اور کاریگروں کو اُن کی واقعی اُجرت سے محروم رکھا جائے اور اصحابِ املاک کو ان کے حقوق غصب کرنے کی اجازت دی جائے، اس لئے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صاحبِ املاک، صرف مزدوروں اور کاریگروں کے حقوق کے غاصب نہیں ہیں بلکہ عام اجتماعِ بشری کے مجرم ہیں۔

دوسری قسم کے قوانین کا مقصد صرف یہی ہے کہ سرمایہ داروں اور امیروں کی اعانت

کی جائے تاکہ اُن کا تسلط جمہور پر قایم رہے اور اِس مقصد میں شخصی، دستوری اور جمہوری تمام حکومتیں متفق نظر آتی ہیں۔

تیسری قسم کے قوانین، جو افراد کی حمایت کرتے ہیں، اپنی غایت کو پورا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ قوانین، مجرم کو سزا دیکر اُسے آیندہ ارتکاب جرم سے باز رکھنا چاہتے ہیں، لیکن تجربات شاہد ہیں کہ سزا کبھی مجرم کو ارتکابِ جرم سے باز نہیں رکھتی۔ جو شخص، جوشِ انتقام یا فاقہ کی وجہ سے کسی جرم کا اقدام کرتا ہے، اُس کی نظر ہرگز عواقب پر نہیں ہوتی۔ بڑے شہروں میں ایک ایک دن کے اندر کئی مجرموں کو سزاے موت دی جاتی ہے اور اُسی دن وہاں متعدد واقعے قتل کے ہو جاتے ہیں۔ اِس کا سبب صرف یہ ہے کہ جیل خانوں میں مقید رکھنے کی رسم مجرموں کے اخلاق کو اور زیادہ خراب کر دیتی ہے اور جب تک تعزیر کے موجودہ اصول بدل نہ جائیں گے، اُس وقت تک انسدادِ جرائم محال ہے۔

اسی بنا پر، کروپٹکین کا خیال ہے کہ "نظامِ بشری کے آیندہ انقلابات، انسان کو قوانین سے بے نیاز کر دیں گے، کیونکہ پابندی قوانین، فطرتِ انسانی کے منافی ہے۔ قوانین کو ظاہر ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا، اور بشریت، دورِ قوانین سے قبل ہزاروں برس تک اپنے نظام کو قایم رکھ سکی ہے۔ اُس زمانہ میں، نظامِ بشری کا شیرازہ، انسان کی صرف چند فطری عادات سے مرکب تھا۔ جب سے افرادِ انسانی، غالب و مغلوب، تابع و متبوع، دو فریق میں تقسیم ہو گئے ہیں، اسی وقت سے غالب فریق نے، اپنا تسلط قایم رکھنے کے لئے قوانین وضع کئے اور فوجی طاقت کے ذریعہ سے، عام افراد پر اُن کا نفاذ کیا۔ لیکن اب وہ وقت قریب ہے کہ انسان قانون کی پابندی چھوڑ دے، کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ دُنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، جو قانون کی عامیانہ پابندی کے بالکل مخالف ہیں اور جب تک کسی قانون کی غرض و مصلحت متحقق نہ ہو جائے، اسپر کاربند ہونا ضروری نہیں سمجھتے۔

پھر جب دُنیا سے قانون اُٹھ جائے گا، تو انسان صرف اپنی فطری عادات پر قایم رہے گا، جو ارادۂ عامہ کے ماتحت ظہور میں آئیں گی اور اِن کے نفاذ کے ضامن وہ روابط و باہمی تعلقات ہونگے، جو اشتراکِ عمل اور باہمی سعی سے پیدا ہوتے ہیں، اور مخالفین کی سزا صرف یہ ہوگی کہ انہیں

ہیئت اجتماعی سے خارج کردیا جائے۔

حکومت کے متعلق اس کی رائے کروپٹکن کو یقین ہے کہ سلطنتوں کا خاتمہ بہت جلد ہونے والا ہے، جس کے بعد نوعِ انسان کے لئے ممکن ہوگا کہ وہ ترقی کے انتہائی مدارج تک پہونچ جائے۔

وہ کہتا ہے کہ سلطنتوں کا وجود کسی تاویل سے بھی مفید ثابت نہیں ہوسکتا۔ حکومت بجائے اس کے کہ مالدار لوگوں کے تسلط کو روکے، قوی کو ضعیف پر ظلم کرنے سے باز رکھے، افراد کے مساعیٔ عامہ کو اور زیادہ کچلتی ہے، اُن کے حقوق پامال کرتی ہے اور اس مقصد کے لئے وہ اپنی فوجوں سے کام لیتی ہے۔ فوجوں کے مصارف، اگر اُس کی آمدنی سے پورے نہیں ہوتے، تو دوسروں سے قرض لیتی ہے، جس کا بار آیندہ نسلوں پر پڑتا ہے۔

سلطنتوں کے وجود سے بہت بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ آپس میں برسرپیکار ہوتی ہیں اور اس نزاع کا بُرا اثر صرف غربا پر پڑتا ہے، کیونکہ نتائج جنگ اگر اچھے ثابت ہوں تو اُن میں عام رعایا کا کوئی حصہ شامل نہیں ہوتا۔ درانحالیکہ جان دینے کے لئے انہیں کے سامنے دستِ سوال پھیلایا گیا تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس مسئلہ میں تمام حکومتیں، خواہ وہ جمہوری ہوں یا شخصی، سب برابر ہیں۔ اس لئے یہ بالکل محال ہے کہ وہ طبقہ، جو اپنے کو حکومت کے نام سے یاد کرتا ہے مصلحتِ عامہ اور جمہور کے مفاد میں کوشش کرے۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت متعدد اقسام کی آزادیوں کا نام لیا جاتا ہے (مثلاً:- حریتِ مجالس، حریتِ صحافت، حریتِ حقوق) لیکن ان تمام حریتوں سے صرف اسی صورت میں فایدہ اُٹھایا جاسکتا ہے، کہ وہ حکومت و ارکانِ حکومت کے خلاف نہ ہوں اور وجودِ حکومت کو معرضِ خطر میں نہ ڈالتی ہوں، ورنہ جلسے روک دیئے جاتے ہیں، صحافت مقید ہوجاتی ہے، افرادِ قوم گرفتار کرلئے جاتے ہیں، اور حکومت بہ جبر اُن کے گھروں کی حرمت کو زایل کردیتی ہے۔

حکومت، اس اعتبار سے کہ وہ ایک نظامِ اجتماعی ہے، تاریخ بشر میں اس کا وجود زیادہ قدیم نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ اب پھر حکومتوں کے شیرازہ میں انحلال پیدا ہورہا ہے، اقوام عالم

حکومتوں کے جابرانہ اقتدار سے آزاد ہونے کے لئے اپنی پوری کوششیں صرف کر رہی ہیں اور کوئی جماعت، کوئی قوم ایسی نہیں ہے، جو اپنے اندر استقلال ذاتی پیدا کر کے آزادانہ زندگی کی متمنی نہ ہو تاکہ اُسے کسی خاص فرد یا جماعت کے سامنے ذلت کے ساتھ سرِ عجز جھکا دینے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

جب دنیا سے حکومتیں مفقود ہو جائیں گی، تو ان کے بدلے اک حیاتِ اجتماعی قایم ہوگی، جو اپنے مصالح مشترک، حقوق و واجبات کا پورا لحاظ کرے گی اور حقوقِ افراد میں انتہائی مساوات سے کام لے گی۔ پھر اسکے تحت میں، بہت سی جماعتیں قایم ہوں گی اور ہر جماعت کے افراد، حقوق و واجبات میں مساوی اور مصلحت مطلوبہ میں مشترک قرار پائیں گے۔ ہر فرد، جماعت کے ساتھ طے شدہ شرایط کے لحاظ سے تعلق رکھے گا اور شرایط مذکورہ کے نفاذ کے لئے عدالتوں کی ضرورت نہ ہوگی، بلکہ ارتباطِ عام یا شیرازۂ قومی قایم کرنے کے لئے، باہمی احتیاج کافی ہوگی۔ ہر جماعت کا فرد، اپنے فرایض کو باختیارِ خود انجام دے گا، فرائض متعلقہ کی انجام دہی میں کسی دوسرے کا محکوم نہ ہوگا۔ الغرض بہت جلد یہ حقیقت ظاہر ہو جائے گی کہ حصولِ حرّیت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان کسی کام میں اپنی طرف سے کسی اور کو وکیل یا نمایندہ نہ بنائے، بلکہ بذاتِ خود اسکے اہتمام و انصرام کے لئے آمادہ ہو۔

ان اصول پر عمل پیرا ہونے کے بعد، جماعتیں وہی کام انجام دے سکیں گی، جو حکومت انجام دیتی ہے اور اگر کبھی ایسے کاموں کے اجرا کی ضرورت ہوگی، جنہیں کوئی خاص جماعت انجام تک نہیں پہونچا سکتی، تو یہ جماعتیں آپس میں شریک ہو کر اس کو پورا کریں گی اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس طرح موجودہ نظامِ حکومت سے زیادہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں گی۔

ملکیت کے متعلق کروپٹکین کا خیال

وہ کہتا ہے کہ ملکیتِ انفرادی کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ مستقبل میں صرف اشتراکی ملکیت ہونی چاہیئے۔ کیونکہ یہی انفرادی ملکیت وہ بلائے بد ہے، جو بشریت کو مدارجِ کمال سے دُور رکھتی ہے، اور یہی وہ مصیبتِ عظمیٰ ہے، جس کی بدولت آج ہزاروں مزدور بڑے بڑے شہروں میں بیکار پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انفرادی ملکیت، چھوٹے زمینداروں کے لئے نہایت ضروری و

مفید ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ زمیندار کا عہدِ زرین ختم ہو چکا۔ آج کل دُنیا کے اکثر ملکوں میں، زمیندار کی حالت یہ ہے کہ وہ رات دن قرض کی مصیبت میں گرفتار رہتا ہے، کبھی زمین رہن رکھتا ہے، کبھی اپنا ضروری سامان معاشرت بیچتا پھرتا ہے، گویا اس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ قرض خواہوں کا حساب درست رکھے اور بس۔

ملکیت انفرادی کا سب سے بُرا اثر یہ ہوا ہے کہ اس کی وجہ سے، دُنیا میں امیروں کا طبقہ پیدا ہو گیا ہے، جو دوسروں کی مشقت پر نہایت آرام سے زندگی بسر کرتا ہے اور کوئی شک نہیں کہ ہیئت عامہ میں سب سے زیادہ باعثِ فساد یہی طبقہ ہے۔

حق ملکیت بھی، حکومت و قانون کی طرح بالکل جدید بدعت ہے۔ اس سے قبل ہر چیز مشترک تھی، اس لئے اب پھر انفرادی ملکیت کو چھوڑ کر، ملکیتِ اجتماعی کے اصول کے طرف لوٹنا چاہیئے، اور زمانہ کا عام رجحان بتا رہا ہے کہ وہ زمانہ بہت جلد آنے والا ہے جب عام طبقہ مالداروں کی بے شمار دولت پر قبضہ کر لے گا، اور جاہ و دولت کا یہ اعتباری افتخار خاک میں مِل جائے گا۔

عہدِ حاضر میں بالشیوزم کے جو خیالات معلوم ہوئے ہیں، وہ بھی بالکل یہی ہیں جو کروپٹکن نے ظاہر کئے ہیں، لیکن سوال صرف نظریات بنانے اور بگاڑنے کا نہیں ہے، بلکہ انھیں قابلِ عمل ثابت کرنے کا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ فوضویت کے یہ خیالات نہایت دلچسپ ہیں اور استدلال بھی نہایت خوبصورت ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اسپر عمل کیونکر ممکن ہے اور پہلے کن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

سب سے پہلے اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ افرادِ بشری میں غالب و مغلوب، تابع و متبوع کی تفریق کیونکر پیدا ہوئی اور اس کے اسباب کیا تھے۔ اگر وہ اسباب اب بھی موجود ہیں تو فطرت کبھی اس کو گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کے پیدا کئے ہوئے عِلَل بیکار ثابت ہوں اور ان کا کوئی نتیجہ نہ پیدا ہو۔

برتری و تفوق کا مسئلہ نیا نہیں ہے، بلکہ عہدِ عتیق میں بھی اس کا سراغ ملتا ہے۔ اسلئے اگر آج ہم اس امتیاز کو مٹا دینا چاہتے ہیں، اگر تمام افرادِ انسانی کو ایک سطح پر لے آنے کے متمنی

ہیں، تو اس کی تدبیر صرف یہی ہے کہ اسباب تفوق کو اسقدر عام کر دیا جائے کہ ہر شخص اپنی جگہ اک مستقل حیثیت کا مالک ہو جائے اور دیگر افرادِ انسانی اس کو نظرانداز نہ کر سکیں، ورنہ.. یوں تو وہی جہل و علم کی جنگ ہو گی، وہی ضعف و قوت کا مقابلہ ہو گا، جس کا نتیجہ ہمیشہ ایک اور صرف ایک ہی ہوا ہے۔

غزل

نتیجۂ فکر حضرت سُہا دعلیگ)

جذبۂ سرورِ جاں، اضطراب ہو گیا — آرزو کے کھیل میں، دل خراب ہو گیا
یوں ندامتِ ستم کچھ ستم سے کم نہیں — خامشی سے اور وہ لاجواب ہو گیا
ہر نظر کے نذر ہے عہدِ ترکِ عاشقی — رندِ مے پرست کا اجتناب ہو گیا
اُن کی مہربانیاں شب کا خواب ہو گئیں — روز رات کاٹنا، اک عذاب ہو گیا
اپنے جوشِ شوق میں، ہم ہی ہوش میں نہ تھے — ورنہ لاکھ بار وہ بے حجاب ہو گیا
کسقدر فروغ ہے اُسکے رُخ کو حُسن سے — ماہتاب ہو گیا، آفتاب ہو گیا

پھر ترے غرور کا اور کیا دماغ ہے
اب سُہا کا ذکر بھی ناصواب ہو گیا

لالہ رُخ

(از: ل۔احمد)

طامس مور (۱۷۷۹-۱۸۵۲ء) آیرلینڈ کا نہایت مشہور شاعر تھا اور لالہ رُخ اُسی کی تصنیف ہے، جو انگریزی داں طبقہ میں اپنی ادبی خوبیوں کے لحاظ سے خاص عزت کی مستحق سمجھی جاتی ہے۔ اِس کتاب میں چار مثنویاں ہیں، جن میں سے پہلی "ابن مقنع" ہے۔ میں اِس جگہ لالہ رُخ کے متعلق تاریخی نقطۂ نظر سے کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا، البتہ اِس قدر ضرور عرض کروں گا کہ آپ صرف ادبی محاسن کے لحاظ سے اِس کا مطالعہ کیجئے کہ اصل مقصود اس تصنیف کا یہی ہے۔

ہمارے دوست حضرت لطیف اکبرآبادی نے اسی مثنوی سے اخذ و التقاط کر کے یہ فسانہ مرتب کیا ہے، جس کی نزاکت، الفاظِ تعارف کی گرانی کو بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ جس وقت چاروں مثنویاں نگار میں شائع ہو جائیں گی، اس وقت یہ سب علیحدہ اک کتاب کی صورت میں پیش کی جائیں گی اور اُن خصوصیات کے ساتھ جن کی نظیر "صحافت اُردو" شاید ہی پیش کر سکے۔ (اڈیٹر)

خاندان زنج کا مشہور بادشاہ عبداللہ اِس ارادہ سے کہ عمر کا باقی حصہ یادِ الٰہی میں بسر کرے، بخارا ئے کوچک کا تاج و تخت اپنے بیٹے کو سپرد کر کے، حج کی غرض سے روانہ ہوا اور کشمیر کی فرحناک وادیوں کو عبور کرتا ہوا دہلی آیا۔

یہ زمانہ شاہنشاہ اورنگ زیب کے گیارہویں سال جلوس کا تھا۔ اورنگ زیب نے حد درجہ عزت و اکرام کے ساتھ عبداللہ کی پذیرائی کی اور اُس شاندار طریقہ پر، جو میزبان و مہمان دونوں کے شایان شان تھا، فرائض میزبانی ادا کئے۔ خیر مقدم و مدارات میں جس عالی حوصلگی کا اظہار کیا گیا تھا، اُسی عظمت و اہتمام کے ساتھ، عبداللہ، دہلی سے سورت تک (جہاں سے شاہی قافلہ زوّار عربستان کے لئے جہاز پر سوار ہونیوالا تھا) پہنچایا گیا۔

دہلی میں، ملک عبداللہ کے اس چند روزہ قیام کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ شاہنشاہ اورنگ زیب کی سب سے چھوٹی لڑکی، شاہزادی لالہ رخ کی نسبت اُس کے لڑکے کے ساتھ قرار پاگئی۔

لالہ رخ کے حسنِ بے مثال کے اذکار سے اُس وقت تمام شعراء کے کلام معمور تھے، اور اُن کا خیال تھا کہ لالہ رخ کے سامنے لیلیٰ کی ملاحت، شیریں کی صباحت، اور دیول دیوی کی نزاکت، کا ذکر کرنا فطرت کی صناعیوں کے گویا ابتدائی نمونے پیش کرنا ہے، وہ سمجھتے تھے کہ افسانہائے عشق کی تمام وہ حسین دیویاں، جن کے نام مشرق کے شعر و نغمہ کا حسین موضوع قرار پاتے ہیں، اُن چھوٹے چھوٹے پھولوں کی طرح تھیں، جو گلدستے کے حاشئے پر نظر آتے ہیں اور لالہ رخ اس گلدستہ کا مرکزی گلاب!

یہ بھی قرار پایا تھا کہ مراسم عروسی کشمیر کی نکہت بار وادی میں بجالائے جائیں، اور دولھا دلھن چند دن، اس جنتِ ارضی میں قیام کرنے کے بعد دارالسلطنت بخارا کو مراجعت کریں۔

وہ بھی عجیب دن تھا، جب شاہزادی کشمیر کی طرف روانہ ہوئی۔ دہلی کا ہر بازار اطلس و کمخواب کے زرکار پردوں سے آراستہ تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کا تمام سونا چاندی دیواروں پر چڑھا دیا گیا ہے۔ حسین و خوشرنگ لباس پہنے ہوئے بچوں کے گروہ جلوس کے راستے میں پھولوں کو منتشر کرتے پھر رہے تھے؛ جو ایران کی قدیم رسم "گل افشاں" کی یاد دلاتا تھا، پھولوں کے تعطر کا یہ عالم تھا گویا اس طرف سے ختن کا کوئی قافلہ مشک کا انبار لئے ہوئے گذر گیا ہے۔ جمنا کے شفاف پانی پر صدہا آراستہ کشتیاں اسطرح دوڑتی پھر رہی تھیں گویا وہ خود پانی کی امواجِ رنگین تھیں۔

شاہزادی، شاہنشاہ سے آخری بار رخصت حاصل کرنے گئی، اور اورنگ زیب نے شفقتِ پدری میں ایک بیش قیمت ہار، چشمِ پرنم کے ساتھ، اپنی پیاری بیٹی کے گلے میں ڈالدیا۔ لالہ رخ نے فقراء و مساکین کے لئے نذریں روانہ کیں اور ملول و غمگین، محافہ میں سوار ہوگئی۔

جس عظمت و شان کے ساتھ یہ جلوس روانہ کیا گیا وہ ایسا نظارہ تھا جسے نگاہِ آفتاب نے شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ محلِ شاہی سے لیکر مضافاتِ شہر کے باغات تک حشم و خدم کا ایک غیر منقطع سلسلہ قایم تھا۔ تمام امراء و اراکین اپنے پورے تزک و احتشام کے ساتھ شریکِ جلوس تھے، اور شاہزادی لالہ رخ اپنے محافہ میں ایک حسین دیوی کی مورت کی مانند مسندِ تمکین کی نازش بنی ہوئی بیٹھی تھی۔

محافہ کی کھڑکیوں پر ہلکے گلابی رنگ کی ریشمی چلمنیں پڑی ہوئی تھیں، تاتاری و کشمیری خواصیں سفید عربی گھوڑوں پر سوار محافہ کا حلقہ کئے ہوئے تھیں جن کو شاہِ بخارا نے شاہزادی کی جلو میں چلنے کے لئے مخصوص طور پر بھیجا تھا۔

فضل الدین، ناظر اعظم، جو شاہزادی کے محافہ کے پیچھے پیچھے ہوادار میں سوار تھا، باوجود غایت درجہ مرتاض و تنگ مزاج ہونے کے بھی، اس منظر و نمایش سے نہایت خوش تھا۔ اس کی ہمہ گیر قابلیت کا ہر شخص معترف تھا۔ وہ اگر ایک طرف نقاش تھا، ایسا نقاش کہ حسینانِ سرکیشیا کی آنکھوں پر پڑی ہوئی خوبصورت پلکوں کو بھی وہ اپنے موئے قلم سے اچھی طرح ظاہر کر سکتا تھا، تو دوسری طرف حکیمانہ مسایل کے تبحّر اور ادیبانہ نکات کے بیان میں بھی وہ ید طولیٰ رکھتا تھا۔ وہ اگر طب کے نسخوں کی طیاری کا اعلیٰ ترین ماہر تھا، تو غزل قصیدہ گوئی کا بھی بہترین اُستاد تھا، اور یہی باعث تھا کہ اُس وقت کے تمام شعرا اس کا احترام کرتے تھے اور عام تنظم حکومت میں بھی اُسے بڑا اقتدار حاصل تھا۔

سفر کے ابتدائی ایام میں لالہ رُخ کی فرحت و دلچسپی کے لئے (جس کی ساری عمر دہلی کے شاہی باغات کے سایوں میں گذری تھی) روز مناظر کا بدلتا رہنا یقیناً لذتِ ذوق و نظر تھا، کیونکہ جب آفتاب کی تپش کے بعد شام کے وقت یہ قافلہ عروسی کسی دریا یا چشمے کے کنارے قیام کرتا، تو طبیعت کو عجیب لطف و سکون حاصل ہوتا تھا، لیکن اُسکی جدّت پسند طبیعت اور عنفوانِ شباب کا تلوّن اب اس لطف سے بھی بیزار نظر آتا تھا۔ خواصوں کی ظرافت اور ناظر اعظم کے لطایف (یہی تنہا ایک مرد تھا جو شاہزادی کے خیمہ میں داخل ہو سکتا تھا) اگرچہ اس قابل ہوتے تھے کہ وہ لمحاتِ بیداری، جب فرقِ ناز آشنائے بالش نہیں ہوتا، ان کے نذر کر دئے جائیں، مگر لالہ رخ کو اُن سے بھی کوئی دلچسپی نہ رہ گئی تھی۔ شاہزادی کی نہایت محبوب کنیز ایک ایرانی خادمہ تھی جو اکثر شاہزادی کو بستر خواب پر اپنے لطیف و دلنشین گیتوں سے سُلانے کی کوشش کیا کرتی تھی، یہ کنیز اپنے مسکرِ لحن میں کبھی تو وامق و عذرا کا فسانۂ عشق سُنایا کرتی، اور کبھی شیریں و فرہاد کا رومانِ محبت، مگر ان دنوں لالہ رُخ کو اُس کے فسانوں میں بھی کوئی لطف نہ آتا تھا۔ دورانِ سفر میں بعض مقامات پر کرشن کے پجاریوں نے شوالوں کی

مغنیہ پاتروں کو بھی شاہزادی کی طبیعت مسرور کرنے کے لئے بھیجا، مگر یہ شغل بھی لالہ رخ کے تکدر کو دور نہ کرسکا اور قیام کی ساعتیں تو خصوصیت کے ساتھ نہایت ہی بے مزا گذرنے لگیں۔

اس حالتِ تکدر کو دُور کرنے کے لئے دفعتہً یہ خیال پیدا ہوا کہ شاہِ بخارا کے بھیجے ہوئے خدام کے ساتھ جو نوجوان کشمیری شاعر آیا ہے، اور جس کے خوشنوائی کی سارے کشمیر میں شہرت ہے طلب کیا جائے۔ کہا جاتا تھا کہ وہ مشرقِ قدیم کے افسانے ایک خاص طرزِ ترنم کے ساتھ سناتا ہے، جس کی دلکشی بیان سے باہر ہے۔ علاوہ اسکے شاہِ بخارا کی طرف سے اُسے اجازت بھی تھی کہ شاہزادی کے خیمہ میں داخل ہوکر اپنے نغمہ دلنواز سے شاہزادی کا جی بہلائے۔ شاعر کا لفظ سُنتے ہی فضل الدین چیں بجبیں ہوا۔ وہ اس لحاظ سے ایسا خشک واقع ہوا تھا کہ رقاصہ ہائے کرشن کے حنا بستہ پانوں کی طلائی پازیبوں کی جھنکار میں بھی اُسے کوئی دلکشی نظر نہ آتی تھی چہ جائیکہ ایک گمنام شاعر لیکن چونکہ شہزادی کی کبیدگی طبع سے، وہ خود بھی حیران و متفکر تھا اس لئے اُس نے شاعر کے حاضر کئے جانے کا حکم دیا۔

فرامرز حاضر کیا گیا۔ چونکہ شاہزادی اس سے قبل اپنے حجلہ کی جھلملیوں سے اس شاعر کو شاہنشاہ اورنگ زیب کے دربار میں داخل ہوتے دیکھ چکی تھی، جس وقت شاہِ بخارا کے بھیجے ہوئے تحائف و خدام پیش کئے جارہے تھے، اور چونکہ اُس وقت شاہزادی نے اُس کے متعلق کوئی پسندیدہ رائے قائم نہیں کی تھی، اس لئے اس وقت بھی اُسے کوئی خاص توقع دلبستگی کی اس شاعر کی طرف سے پیدا نہیں ہوئی۔

فرامرز کا عین عنفوانِ شباب تھا۔ اُس کی عمر تقریباً شاہزادی کی عمر کے برابر تھی۔ اُس کے مردانہ حسن میں وہ شان دلکشی پائی جاتی تھی جو ہندوستان کی عورتوں کو اُن کے پُرشباب خدائے حسن، کرشن کی مورت میں نظر آتی ہے، وہ کرشن جس کی آنکھوں سے اِن پرستارانِ محبت کو موسیقی سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے، اور جس کے خیال سے اُن کے جذباتِ پرستش میں ایک ہیجانِ محبت پیدا ہو جاتا ہے۔

فرامرز کا لباس اگرچہ سادہ تھا مگر قیمتی، اور اُس کی خوش ذوقی کو ظاہر کرنے والا! اُسکے گلکار، کاشانی مخمل کے کمر بند میں خوبصورت موتیوں کی جھالر لٹک رہی تھی۔ جس کی بے ترتیبی

میں بھی اک جشن پیدا تھا۔ کشمیری نوجوان نے اپنا ستار اٹھایا، وہ ستار جسے دوشیزگانِ عرب قصر الحمرا کے باغات نارنج کے اندر چاندنی میں سُنا کرتی تھیں۔

فرامرز نے، شاہزادی لالہ رُخ سے مراسم کورنش بجالاکر عرض کیا، کہ جو مثنوی وہ سُنانے والا ہے اس کا تعلق خراسان کے اُس نقاب پوش پیغمبر سے ہے جس نے سرزمین مشرق پر ۱۶۳ھ میں ایک ہنگامہ عظیم برپا کر دیا تھا۔ اس کے بعد اُس نے یوں گانا شروع کیا:۔

"خراسان کا نقاب پوش پیمبر"

سرزمینِ فارس کے شاداب قطعۂ ملک میں، جہاں مہرِ عالمتاب روزانہ اپنی اچھوتی کرنیں نچھاور کیا کرتا ہے، جہاں آفتاب کی روشن شعاعیں، رنگین پھولوں اور شیریں پھلوں کے ساتھ ملی ہوئی، قدرتی چشموں کے اندر اپنا حسن دیکھ دیکھ کر رنگِ انفعال میں ڈوب ڈوب جاتی ہیں، جہاں رودِ مرگا کنجوں اور محلوں کے اندر ہو کر بہتا رہتا ہے، عظیم الشان مقنع، اپنے تختِ عظمت و جلال پر متمکن ہے۔ اس کا چہرہ نقاب میں، باریک نقرئی تاروں کے نقاب میں مستور ہے، کیونکہ انسانی نظریں اس کی تجلی و جمال کے نظارہ کی تاب نہیں لاسکتی ہیں۔ منتخب معتقدین کی جماعت، جو تبلیغاتِ ابنِ مقنع کی حمایت و حفاظت میں نوکِ شمشیر کی جنبش کو طلاقتِ لسانی سے زیادہ فصیح سمجھتی ہے، دونوں طرف صف بستہ ہے۔ اس جماعت میں ایک متنفس بھی ایسا نہیں جو اپنے امامِ ملت کا ادنیٰ سا اشارہ پانے کے بعد اپنے دل کو نیامِ شمشیر بنا دینے میں ذرا بھی تامل کرے، اور اس کی جنبشِ لب پر اپنی جان دے دینا باعثِ نجات نہ خیال کرتا ہو۔

ابنِ مقنع اور اس کی جماعت کو جو بغض و عناد، خلافتِ بغداد کے پرچم شب رنگ کے ساتھ ہے، اس کا اندازہ ان حربی طیاریوں سے ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک شخص اپنے فدا کارانہ جذبات میں موت و زیست، دونوں حالتوں کو جناتِ نعیم کا ضامن سمجھتا ہے! اور اس ولولہ کے ماتحت وہ اپنے حقیر سے حقیر سلاحِ جنگ کو بھی ہر وقت صیقل آگیں رکھنے میں

منہمک ہے۔

ایوانِ تخت اور اس کی سقفِ طلاکار کے درمیان، جو مرصع ستونوں پر قایم ہے، وہ رواقہاے حرم تعمیر کئے گئے ہیں، جن کے غرفوں پر حریر و دیبا کے نفیس و نازک اور ہلکے رنگ کے پردے پڑے ہوئے ہیں، اور جس طرح ایک ہلکے پارۂ ابر میں سے، حد درجہ سرعت کے ساتھ، کبھی کبھی نگاہِ انسانی کے سامنے بجلی چمک جاتی ہے، اسی طرح ان باریک و خوش رنگ پردوں میں سے بھی گاہے گاہے، ایوانِ محتشم کے مکینوں پر، برقِ نظر کوند جایا کرتی ہے۔ یہ اجتماعِ نزہت و پاکیزگی، یہ محشرستانِ حسن و جمال! کون کہہ سکتا ہے کہ یہاں کوئی انسانی قوت کام کر رہی ہے، اور کس کو یہ سمجھنے کی جرأت ہو سکتی ہے کہ مقنع نے دنیاوی اغراض کے لئے قدرت کے ان نازک ترین صنائع کو یکجا کیا ہے! معلوم ہو رہا ہے کہ چند دن کے لئے فردوس مع اپنی تمام حسین آبادی کے زمین پر منتقل کر دی گئی ہے، اور خدا جانے کس وقت یہ سارا ایوان پھر پر لگا کر اڑ جائے گا۔ چشمِ آفتاب جہاں تک دیکھ سکتی ہے وہاں تک کوئی خوبصورت نسلِ انسانی ایسی نہ تھی، جس کے چمنستانِ حسن کے بہترین شگوفہاے نمو یہاں مہیا نہ کئے گئے ہوں، ہندوستان کے منور چشموں کے کنارے، شوالوں میں جبینِ نیاز جھکا دینے والی کنواریاں، یمن کی وادیوں میں حشرِ خرام برپا کرنے والی دوشیزگانِ نوخیز، ایران کی آہو چشمانِ شوخ و مضطرب، خطا کی نیم نگاہانِ فسوں پرداز، جارجیا کے غنچہ ہاے نورس، عرب کی تبسم ریزانِ ملیح اور زرین حلقہ ہاے گیسو رکھنے والی لعبتانِ فرنگ، غرض ہر حصۂ زمین نے اپنے بہترین پھول مقنع کی اس فردوسِ ارضی کی آرایش کے لئے پیش کر دئے تھے۔ لیکن یہ نمایشِ اسلحہ کیسی؟

مقلدین مقنع کے ہجوم سے سارا ایوان بھرا ہوا ہے۔ برقع پوش پیغمبر کی ادنیٰ اشارے پر تمام حاضرین کے سر جھک جاتے ہیں اور ان کے رنگا رنگ لباسوں میں ایسا تموج پیدا ہو جاتا ہے، جس طرح مختلف الالوان تختہ ہاے لالہ زار پر ہوا کا کوئی سخت جھونکا گذر جاے۔ وہ کون سا جدید راز ہے جس پر آج تمام مقلدین اپنے خون سے مہر ارادت ثبت کرنے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں، اور وہ کونسا نیا معجزہ ہے جسے دلیر مقنع آج اس اہتمام کے ساتھ پیش کرنے والا ہے۔؟

ایوان کے سامنے ہجوم و انبوہ میں سے ایک نوجوان محارب، نمودار ہو کر جلوہ گاہِ رسالت کی طرف آرہا ہے، اُس کے ہاتھ میں نقرئی کمان ہے، قیمتی ریشم کا رومال کمر سے لپٹا ہوا ہے، بخاری وضع کی سموری ٹوپی زیب سر ہے، آنکھیں اس طرح چمک رہی ہیں، جیسے گرمی کی رات میں مریخ۔ یہ نوجوان اس لئے آیا ہے کہ مقنع کا مذہب اختیار کرے اور اس کے الہامی جھنڈے کے نیچے کھڑا ہو۔

عظیم ہر چند ابھی بالکل نوجوان تھا لیکن برف پوش کوہ اولمپیا کے اُس طرف، مغربی ممالک میں اسکی شہرت ضرب المثل ہو چکی تھی اور قبل اس کے کہ شباب اپنی سبزی اُس کے رخساروں پر نمودار کرتا، وہ ایک زبردست جنگ میں دادِ سپہ گری دیکر، یونانیوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا تھا، اور جب تک صلح نہ ہو گئی وہیں قید رہا۔ پھر ایسا کون ہوسکتا تھا، جو سرزمین یونان پر قدم رکھتا اور اس کے خیالات میں رفعت اور جذبات میں علو نہ پیدا ہو جاتا تا جواپنے پہلو میں دل اور چہرہ میں آنکھیں رکھنے کے باوجود اُس سرزمین حریت آزادی کی فضا سے متاثر نہوتا چنانچہ جب عظیم اپنے وطنِ عزیز کو واپس ہو رہا تھا تو اُسکی نیندیں بھی آزادی کے خواب سے معمور تھیں، اور اُسکا دماغ حریت کے افتخار آگیں جذبات سے لبریز تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ فریب خوردہ تخیل تھا۔ جس طرح اُفق کی حسین فریب کاری ہماری نظروں کو آسمان و زمین کے اتصال کا یقین دلاتی رہتی ہے، اسی طرح جسوقت عظیم نے سُنا کہ ایک مقدس تلوار بنی نوع انسان کی بہبودی کے لئے بلند کی گئی ہے، اور جس وقت اُسے ابن مقنع کے لشکر کا لہراتا ہوا یکرنگ سفید جھنڈا دیکھا، جس پر "حریتِ عالم" کے درخشاں الفاظ روشن و منقوش تھے، اُس کا عقیدہ اسیوقت قایم ہو گیا اور اس کی روح و شمشیر دونوں نے اس الہامی دعوت کو لبیک کہدیا۔

مقنع کے دربار کی مخصوص طیاریاں جس نئے معجزہ کے اظہار کیلئے تھیں وہ اسی نوجوان ہستی کے حلقہ بگوش ہونے کا معجزہ تھا۔ کیونکہ مقنع پر روشن تھا کہ عظیم کی تنہا ہستی کسی طرح ایک پوری فوج سے کم نہیں ہے۔ آہ، تلاش و حقیقت کے جوش میں بے بصر ہو جانے کی مثال شاید ہی کوئی ایسی دوسری نظر آسکتی ہے، اور شاید ہی کوئی روحِ انسانی، عظیم کی روح سے زیادہ سرورِ غیبی کی فریفتہ ہوسکتی ہے! یہی باعث ہے کہ یہ جوش و شوق سے معمور، نوجوان سپاہی مقنع

کے رعب سے زرد ہو رہا ہے، اور اُسے یقین کامل ہے کہ جس وجود کے سامنے وہ زمین بوس ہو رہا ہے وہ ایک فرشتۂ رحمت ہے جو دُنیا کو ذلت و ظلمت سے آزاد کرنے آیا ہے۔

عظیم کے جھکتے ہی تمام عقیدت مند جماعت کے سر، زمین سے لگ گئے اور نعرۂ اللہ ایک بلند و دیرپا آواز کے ساتھ بلند ہوا۔ مسندِ پیغمبری کے اوپر صدہا بیرقیں، جو ایوان کے اندر آنے والی شعاعِ آفتاب کی روشنی میں لہرا رہی تھیں، سایہ افگن تھیں، جس طرح سلیمانؑ کے سر پر سفید طیور اپنے پروں کو پھیلائے رہتے تھے۔ نقرئی نقاب حرکت میں آیا اور اُسکے اندر سے نکلکر یہ آواز فضا میں گونجنے لگی:۔

'اے نو وارد! ہر چند ہم سب دیکھتے ہیں کہ اسوقت تیری روح کا مسکن یہ جسمِ خاکی ہے، لیکن اس روح کا طریق سفر مجھ پر اُس زمانہ سے روشن ہے، جس کی کوئی ابتدا متعین نہیں ہو سکتی۔ مجھے ہر ہر موقع کا علم ہے کہ کب اور کس طرح تبدیل قالب ہوتا رہا ہے۔ جس طرح میں ارواحِ آتشیں کا حال جانتا ہوں کہ وہ کیونکر یکے بعد دیگرے نئے نئے منور قالب اختیار کرتی رہتی ہیں، اسی طرح مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تیری روح کا غیر فانی شعلہ اس وقت تک کہاں کہاں رہا اور وہ کیونکر مقصودِ حقیقی کو پا سکتا ہے۔

یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ تغیرِ جسم صرف دُنیا داروں کی ارواح کا طریق کار ہے، نہیں بلکہ تمام مقدس ہستیاں بھی اس فنا پذیر تاریکی میں سے گذرتی ہیں، تاکہ انجام کار وہ نورانیت حاصل کر لیں۔ یہی تنویر وہ جوہر تھا جو آدم کے وجود میں چمکا اور تمام مکینانِ عرش نے سوائے ایک مغرور ہستی کے اُسے سجدہ کیا۔ اور پھر مختلف زمانوں میں مختلف پیغمبروں کی ہستیوں میں جلوہ افروز ہوتا رہا۔ یہی وہ شعلہ تھا جو موسٰیؑ کی ہستی میں روشن ہوا، عیسٰیؑ کے قالب میں منور ہوا اور پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سینہ میں مشتعل رہا! پھر جس طرح ایک چشمہ جاری ہو کر پہاڑوں کی بلندی سے گرتا ہوا زمین کی سطح پر بہتا ہوا ایک جھیل میں استقلال پذیر ہو جاتا ہے، اسی طرح اس روحِ مقدس کا مظہر اسوقت میری ذات ہے'

ان الفاظ کے ادا ہونے پر مجمع میں حرکت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور ہزارہا آوازیں

تحیتہ وصلوٰۃ میں بلند ہو جاتی ہیں، تلواروں کی نوکیں آسمان کی سمت اُٹھ جاتی ہیں اور تخت کے اوپر غرفوں کے پردے، وہ پردے جن کے لئے اندر کے تماشائے جمال کو مستور رکھنا دشوار تھا، جنبش میں آتے ہیں۔ مرمریں کلائیاں، کافوری سواعد، دلکش و نظر فریب ریشمی رومالوں کو جنبش میں لاکر سارے ایوان میں ایک تعطر لطیف پیدا کر دیتے ہیں، اور یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا حوریں بھی اپنے کنجہائے فردوس سے عظیم کا خیر مقدم کر رہی ہیں۔

لیکن جو کچھ میں نے کہا، نقاب سیمیں پھر ان لفظوں کی آواز سے متحرک ہوا "وہ ایسے ارفع و اعلیٰ حقایق ہیں جو مقدس تر زمانہ کے طلبگار ہیں، اسلئے یہ تلواریں، جو تمہاری زیب کمر ہیں، ان کو بلند ہونا چاہیئے تاکہ انسانیت کی ظلمت و تاریکی کا قید خانہ مسمار کیا جاے، معصیت آلودہ دُنیا آنے والی طمانیت کی جلوہ افروزی کی اہل ہو سکے اور صداقت کی روشنی اُسے منور کر دے۔

اے شمشیر بردارانِ حق و صداقت، صرف اُس وقت، جبکہ تمام دُنیا کی حکومتوں کے جھنڈے تمہارے عَلم مقدس کے سامنے سرنگوں، اور تمام مذاہب عالم کی عبادتگاہیں تمہارے مذہب کی طاقت سے مسمار ہو جائیں گی، آزاد شدہ انسان اپنے سلاسل غلامی، ظالم بادشاہ اپنے دیہیم مکلل، فاتح اپنے غنایم اور مذہبی واعظ اپنی کتابوں کو ان قدموں پر ڈالدیں گے، صداقت کے لبوں کا عظمت زا تنفس ایک بگولہ کی طرح انسانی سیہ کاریوں کے تاریک پہاڑوں کو منتشر کر دیگا، ہاں، صرف اس وقت، دنیا پر حقیقت کی حکومت قایم ہو سکے گی، اور انسانیت حیات سے معمور ہو کر بہار عالم کے اُس ابر درخشاں کی روشنی میں گامزن ہو گی، جس کی پاکی و صفائی کے سامنے بلور کی حقیقت اک فریب ہے۔ یہ وہ وقت ہو گا کہ تمہارے پیغمبر کی ملکوتی پیشانی کا نقاب، جو اُس کے جمال کو چھپائے ہوئے ہے، دفعتہً اُٹھ جائے اور مسرور و مطمئن دُنیا اُس کے چہرہ کے برکات و تجلیات سے جگمگا اُٹھے۔

پس اے نوجوان سپہ گر، میں تیرا خیر مقدم کرتا ہوں اور آگاہ کرتا ہوں کہ تجھے ہنوز بہت کچھ سیکھنا ہے اور اپنی کمزوریوں کو خیرباد کہنا ہے، یہاں تک کہ تجھے وہ درجہ حاصل ہو کہ تیری دستار سفید طرہ کے اعزاز سے آراستہ کیجائے، سکو، اور کر کہ میرے الطاف، میری برکتیں تجھ پر نازل

ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔

دربار ختم ہو گیا اور درباری رخصت ہو گئے۔ مگر ان میں سے ہر ایک کا دل اور کان اس صدا کی گونج سے لبریز ہے۔ نوجوان طبقہ اگر دربار کی عظمت، اسلحۂ جنگ کی آب و تاب اور دوشیزگان حرم کی نیم نگاہیوں سے سرشار و مسحور ہے، تو سن رسیدہ جماعت اطمینان و صداقت کے جذبات سے معمور ہو کر، زمانہ موعودہ کے تصوّر میں غرق نظر آتی ہے! اور صنفِ نازک، پیغمبر خراسان کے تجلی بار پیشانی پر ایک نظر ڈال لینے کے لئے اپنے حسن و جمال کی قربانی پر طیار!

لیکن اس عالمِ اعتقاد و یقین اور دُنیائے امید و توقعات میں پردہ ہائے ریشمین کے اندر منتخب و برگزیدہ نازنینانِ حرم کے ہجوم میں ایک ایسی دوشیزہ بھی تھی، جس کی روح اس نمائش و تماشہ کے کذب سے پامال ہوئی جارہی تھی، اور جس وقت عظیم، تختِ پیغمبری کے بوسہ کے لئے جھک رہا تھا، تو اس کی نگاہیں اسپر پڑیں اور ایک نہ ضبط ہونے والی چیخ اس کے منہ سے نکل گئی۔ حوران ارض کی جماعت نے اس کے ملال و غمگینی پر حیرت کی، تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا، مگر وہ کیا جانتی تھیں کہ زلیخا اس نوجوان کو پہچانتی ہے، اور اُسے دیکھ کر وہ خدا جانے کس عالم میں پہونچ گئی ہے؟

(۲)

آہ زلیخا! ایک وقت تھا کہ اُس کی (عظیم کی) ہر نگاہ تیرے نازک دل پر نشان مسرت چھوڑ جاتی تھی، اور تیرا شوق سے بھرا ہوا دل ان دعاہائے صمیم سے لبریز ہوتا تھا کہ اُس کی ایک نگاہِ غلط انداز ہی تجھ پر پڑ جائے، اُس کے لبوں سے نکلی ہوئی کوئی آواز ہی تجھ تک پہونچ جائے اور تو ایک ہی لمحہ کے لئے اُس فضا میں اپنی زندگی بسر کر سکے، جہاں وہ سانس لے رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ اس کی ہنسی تیری نظروں کے لئے ایک طلسم دلکشی تھی، اس کی ہر حرکت میں تجھے ایک غیر معمولی جلوہ نظر آیا کرتا تھا۔

آہ، کیا ہی آسودہ تھا وہ وقت، کہ تیرے ہار کا کوئی پھول، تیرے زیور کا کوئی نگیں اگر اُس نے چھو لیا تو اُس ساعت کے بعد، وہ پھول، وہ نگیں تیرے لئے ایک مقدس چیز ہو کر رہ گیا ہے! اُف وہ بھی کیا ساعتیں تھیں، جبکہ تو اسکی ہستی کے تمام جزئیات کا مطالعہ کرتے ہیں

محو ہو جاتی تھی، یہاں تک کہ اُس کا لہجہ، اسکی نگاہیں، اسکی تمام حرکات تجھ میں منتقل ہو جاتی تھیں تو اُس کی آواز میں بات کرتی تھی، تو اس کے لبوں سے ہنستی تھی اور اُس کے چہرے کا ہر انداز تیرے چہرے میں منعکس ہو کر نمودار ہوا کرتا تھا۔ وہ قید سے واپس آکر زیادہ دلکشیاں اپنے ساتھ لایا ہے، لیکن افسوس وہ دلکشیاں تیرا حصہ نہیں، وہ دلنوازیاں تیرا مقسوم نہیں، بلکہ اُس کی مراجعت تیرے لئے خوف کی مترادف ہے، گویا وہ کسی دوسرے عالم سے آیا ہے، اور اس لئے آیا ہے کہ تیرے جرم محبت کی خطاکار روح کو صرف آسودگی گم گشتہ کے خوابوں کی تاراجگاہ بنائے، اُن خوابوں کی جو باوجود فراموش ہو جانے کے بھی ہنوز درد خیال بنے ہوئے ہیں۔

زلیخا نے شباب کو عالمِ شباب ہی میں رخصت کر دیا تھا، مگر اُسکے شبابِ رفتہ کا وہ فسانہ پھر اُسے عالمِ شباب ہی میں سُنایا جا رہا ہے، وہ عالم شباب جو ہنوز اُن معصومانہ حسیات و جذبات سے معمور ہے جو کبھی اُس کے تھے۔ ریاضِ ہستی کی بہار کا رومانِ پارینہ پھر اس کے سامنے دُہرایا جا رہا ہے، جس میں اب اُس کے لئے حسرت و الم کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور شاہراہ شباب پر، جو کبھی منور رہ چکی ہے، اس سے پھر لوٹ آنے کی تمنا کیجاتی ہے! درانحالیکہ آرزوؤں اور تمناؤں کے وہ نشاناتِ قدم، جن کا سُراغ اب اُسے بتایا جا رہا ہے، عرصہ ہوا فراموش کر چکی ہے۔

سرزمینِ بنجارا کے کنجہائے باغ اور تاکستان شاہد ہیں کہ کبھی نشوؤ خرمی سے سرشار ہونے والی دو ہستیوں کے نشاناتِ قدم سے اُن کا چپّہ چپّہ آباد تھا، اس کے فردوس زا چشموں کے کنارے، اس امتزاجِ حُسن و محبت کے نغموں سے سرشار تھے، آفتاب صبح کی روشنی میں تبسم کرنے والی امواجِ رودبار سے اور جھکی ہوئی شاخہائے گل، اپنی اچھوتی خوشبوؤں اور رنگینیوں میں، اُس فسانہ کی تکرار کیا کرتی تھیں، جسے اِن دونوں کے شباب نے اس سرزمین پر شروع کیا تھا۔ مگر آغاز جنگ نے اس حیاتِ معاشقہ کا خاتمہ کر دیا۔ فرزندانِ فارس، مادرِ وطن کی طلب پر، فوجوں میں شریک ہو گئے، اور عظیم نے بھی اپنی محبت کی موسیقیوں کو میدانِ جنگ کی پُر ہلاکت آوازوں سے بدلکر، زلیخا کی محبت پاش و شیریں نگاہوں کے

غرض، جنگ کی آتش فشانی اور محبت کی دلبند سلاسل کے بدلے، امواجِ خون کی رنگین زنجیروں کو اختیار کر لیا، اور زلیخا کی مشتاق آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

زلیخا پر، روح کے اس عالمِ بیوگی میں، مہینوں پر مہینے گذرتے گئے۔ اس نے اسی حالت پژمردگی و افسردگی میں موسمِ گرما کے آفتاب کو دو بار چکر لگاتے دیکھا، مگر عظیم واپس نہ آیا، اور زلیخا کی طبیعت بدستور یخ بستہ رہی۔ سچ ہے کہ جب ضیائے خندہ سے روح کو شگفتہ کرنے والی وہ آنکھیں (جن کا تارِ نظر ایک ہی ہوتا ہے) روبرو نہیں ہوتیں، تو گرمی کا آفتاب بھی سرد نظر آنے لگتا ہے۔

کچھ زمانہ تک میدانِ جنگ کی وقتاً فوقتاً مختلف نامبارک افواہیں آتی رہیں لیکن اس آواز میں کہ "عظیم مارا گیا" تیرونشتر کی وہ روانی ہوتی تھی جو زلیخا کے سامعہ کو ہر بار مجروح کر جاتی تھی، بادِ سموم کی وہ گرمی ہوتی تھی جو اس کے غنچۂ دل کو خاکستر بنا جاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دُنیا بھر کی تمام مصیبتوں سے زیادہ وہ مصیبت نہایت شدید ہے، جب تقدیر ایک نوجوان دل کو پہلی بار تنہا و ویران چھوڑ جائے، اور اس تعلق سے محروم کر دے جس کی وجہ سے وہ زندگی سے محبت کرنے لگتا ہے اور موت سے خوف! ایسے دل کی ویرانی اس ازدیادِ رفتہ رباب کی سی ویرانی ہے جو اپنے فائق ترین تاروں کے ٹوٹ جانے کے بعد ایک کونہ میں ڈالدیا گیا ہو اور اس کے نغمے اس کے اندر ہمیشہ کے لئے دفن کر دئیے گئے ہوں۔

زلیخا، اس محزون و دلگرفتہ زلیخا کا یہ غم جانگزا ایسا تھا جہاں عقل و تدبیر کی کارفرمائیاں بھی بیکار ثابت ہوتی ہیں اور استدراک کی قوتِ عاملہ مفلوج ہو جاتی ہے۔ اگرچہ وہ یکسر پامالِ غم ہونے کے بعد بھی اقتضائے عمر کی ولولہ زائی سے اس غمِ اولین کو مغلوب کر کے صحت و شگفتگی واپس لے آئی تھی، مگر اس کے حسیاتِ نازک اب تک مجروح و سوگوار تھے۔ ہر چند اُسکے قلب میں اب بھی وہی حرکت، وہی حرارت اور وہی لطافت موجود تھی، جو اس سے قبل کبھی پائی جاتی تھی، مگر اب اُس کی تمام کیفیتوں پر گم شدگی کی سی حالت طاری تھی۔ وہ متبسم بھی ہوتی تھی، ہنستی بھی تھی، مگر اُسکا تبسم ضیا سے خالی ہوتا تھا اور ہنسی میں کوئی روشنی نہ ہوتی تھی، جب کبھی وہ اپنا بربط اٹھا لیتی اور گانے کی کوشش کرتی تو اس کی مثال

اس عندلیب کی سی ہوتی، جس کی موسیقی میں مسرت برائے نام اور غم بہت زیادہ ہوتا ہے۔

ابنِ مقنع کے واعظ و مبلغین تمام اطرافِ ممالک میں اس غرض سے روانہ کئے گئے تھے کہ وہ اپنے پیغمبر کی موعودہ جنات نعیم کے لئے حسین آنکھوں والی اور عقیق آسا لب رکھنے والی خوبصورت، دوشیزہ لڑکیاں فراہم کرتے رہیں۔ چنانچہ جب یہ واعظ زلیخا کے ملک میں پہونچے تو اس کے غمزدہ دل میں بھی شوق کی ایک آگ مشتعل ہوگئی، اور انتہائے شوق و سرگرمی نے اس پر پورا تسلط پالیا۔ ''وہ جناتِ نعیم کے لئے مقبول کی جائے گی۔ بہشت کے لازوال قصروں میں قضا و قدر کے منشا سے کسی برگزیدہ نوجوان کی عروس تجویز کی جائے گی!'' یہ وعدہ اس کے لئے یقین دلانے والا تھا کہ وہ اسی طرح عالمِ ارواح میں عظیم سے ملے گی، وہ عظیم جس کے متعلق وہ سمجھتی تھی کہ جنگ میں مارا گیا اور اب اسکی روح جنت کے کسی باغ میں صرف اسکا انتظار کر رہی ہے۔

مگر افسوس ہے تجھ پر اے زلیخا! تجھے خبر نہیں تھی کہ شادان و فرحاں نازنینان حرم جو باغہائے ارم کی آبادی کے لئے لائی گئی تھیں اس مقنع کی سیہ کارانہ خواہشات کی قربانگاہ پر چڑھائی جا چکی ہیں، اور وہ تجھے بھی اپنی شعلۂ خواہشات کی نجاستوں کا شکار بنانا چاہے گا۔ مگر نہیں، امتیاز سلیم کی روشنی بالکل افسردہ ہوکر تجھے ظلمتوں میں نہیں چھوڑ سکتی۔ تیرے پاس ایک حرزِ جاں موجود ہے جو تیرے قلبِ صافی پر منقوش ہو چکا ہے، وہ تجھے اس معصیت سے محفوظ رکھے گا، تیرے غنچۂ عصمت کو بدستور شاداب رکھے گا، جس کی پژمردگی محبت کی فنا ہے۔ لیکن نازک و بیخود زلیخا کے نسائی مزاج میں ایک اشتعال پیدا کیا گیا۔ اس کے جذبات میں بے چینی و اضطراب نمودار ہوا۔ کیونکہ مقنع کے مکار واعظوں نے اس کو یہ سنا سنا کر کہ وہ پیغمبر کی نہایت برگزیدہ اور مخصوص منظورِ نظر بنائی جائے گی، اس میں ایک خاص قسم کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ زلیخا کے دل و دماغ کے سامنے لذت و الم کے مختلف پہلو یکے بعد دیگرے پیش کئے گئے کہ غمگینی دوام کا نتیجہ جنون ہے، جس کی آگ امید سوز ہوتی ہے اور یایوس انسان اپنے مدعائے دل سے دوسری دنیا میں بھی محروم رہے گا۔ لیکن وہ

اعتقاد جو پیغمبرِ نقاب پوش نے عالم کے سامنے پیش کیا ہے، ایک دعوتِ مسرت ہے، اور رحمت کی امید لے کر جانے والا انسان بہشت میں اپنے مدعاے دلی سے شادکام کیا جائیگا۔

زلیخا کے لئے یہ اذکار و بیانات ایک محفلِ عشرت، ایک جلسۂ لطف لے کر آئے، جہاں اُسے معلوم ہوتا تھا کہ ہر طرف موسیقی و شعر سانس لے رہے ہیں، اور جہاں کی ہر شے اُسے پاک و مقدس نظر آتی تھی۔ وہ اپنی اِن شیریں آرزوؤں اور تمناؤں سے شادکام تھی کہ وہ عظیم کے پہلو میں اُس کی عروس بن کر عالمِ نکہت و تعطر میں مصروف گلگشت ہوا کریگی۔

زلیخا نے جنتِ ارضی (حرمِ مقنع) میں داخل ہو کر فراوانی عشرت کا نظارہ کیا اور وہ سب کچھ دیکھا جس کا اُس سے وعدہ کیا گیا تھا، لیکن اِس مقامِ عشرت کی حقیقت کا علم اُسے اُس وقت ہوا جب اس سے رازداری کا عہد و پیماں لیا گیا، اور اِس سلسلہ میں وہ ایک جامِ ارغوانی کے پینے پر مجبور کی گئی۔ اس سے قبل یہ جرعۂ زہرناک ہر ارادت مند کے حلقوم سے اُتر چکا تھا، اور جس کی سم آلود تلخ لذت، زلیخا کے کام و دہن سے کبھی زائل نہ ہو سکے گی۔ مقنع نے زلیخا کو اپنے عہد و پیمان کی تاریک بندشوں میں مقید کر لیا تھا۔ اس سے عہد لے لیا گیا تھا کہ زلیخا اُس وقت تک، جب تک کہ مقنع کی پر اسرار ہستی صفحۂ دنیا پر موجود ہے، جس وقت تک سقفِ کبودی اِن دونوں کے سروں پر قایم ہے، اپنی قسم کے مطابق (جس میں زمانہ بھر کی ملامتوں کی خوفناک شکلیں پیدا کر دی گئی تھیں) رنج و الم، مسرت و انبساط، غرض کسی حالت میں مقنع کے پہلو سے جدا نہ ہوگی۔ چنانچہ اِس منحوس ساعت کے بعد سے زلیخا تمام تر مقنع اور اس کے مذہب کی ملکیت ہو گئی، اور اب وہ اپنے تئیں ایک برباد شدہ لڑکی سمجھتی تھی۔ البتہ اُس کا دل و دماغ کبھی کبھی گرم ہو جاتا تھا، جس وقت حرم کی پر جمال لڑکیاں اُسے "خاتونِ رسالت" کہکر خطاب کرتی تھیں، اسکی حسین و خوبصورت آنکھوں سے روشنی و نور کی جھلک نمودار ہو جاتی تھی، جب حورانِ حرم اس کے سامنے سجدۂ عبودیت میں گر جاتی تھیں۔ اِس حالت میں جب اس کے نرم و نازک اعضا میں جنبش پیدا ہوتی تو یہ معلوم ہوتا کہ نازک شاخِ گل پر سے کوئی بلبل اُڑ کر چلی گئی ہے۔ جب مسکراتی، تو اس کے پنکھڑی ایسے لبوں کا خم، دلوں کے لئے ایک نویدِ سرور،

بن جاتا تھا۔ وہ بعض اوقات حالتِ انفعال میں بھی نظر آتی، مگر اس بشریت کی تابش کا تخیل، جسپر زلیخا کو کوئی قابو نہ تھا، پھر اسکو مغلوب کر لیتا، اور اسکے خرمنِ دل پر، جو یقیناً خاکستر ہو چکا تھا، پھر بجلی سی کوندجاتی!

یہ تھا زلیخا کا حال اور کس قدر متبائن تھا اُسکے ماضی سے، جب چند ہی سال قبل بادام کے درختوں کے جھنڈوں میں حیات کی تمام مسرتوں کے ساتھ وہ عظیم کے پہلو بہ پہلو پھرا کرتی تھی۔ لیکن آج جب اُسنے دیکھا کہ وہی عظیم جس کو وہ مردہ سمجھ کر اپنے سارے اثنکِ حیات ختم کر چکی تھی، زندہ اور متحرک، اس کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے، تو اُس پر اک ردِ عمل کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور تھوڑی دیر کے لئے وہ، ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی!

(۳)

عالمِ یاس و سرگشتگی میں جب ذہن ماؤف ہو جاتا ہے، اور اُس کی طاقتِ عمل میں آثارِ حیات باقی نہیں رہتے، تو ناگہاں عقل و تدبیر کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر قایم ہو جاتا ہے۔ جس وقت دماغ، مایوسی کی تاریکیوں کا مسکن ہو جاتا ہے، تو آفتابِ عقل کی شعاعیں یکبارگی داخل ہو کر اُسے منور کر دیتی ہیں۔ محاصر افواج جب خستہ و مضمحل ہو جاتی ہیں اور کوئی صورت کامیابی کی باقی نہیں رہ جاتی، تو قلعہ کے اندر ہی سے ایک غیر متوقع صورت امداد کی پیدا ہو جاتی ہے، اور دماغوں میں ایک صحیح و سحر کارانہ خیال پیدا ہو کر قلعہ کا دروازہ محاصرین کے لئے کھول دیتا ہے۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کیونکر ہوتا ہے اور کون کرتا ہے؟ کاش یہی صورت اے محزون دوشیزہ، تیرے لئے بھی پیدا ہو جاتی، ہر چند تیرے لئے ایک شعاعِ نور نمودار ہو رہی ہے اور تیرے حواس کے پُر پیچ راستے کو روشن کرتی ہے، مگر اُس میں رہنمائی کی استعداد نہیں ہے، وہ مضطرو بیتاب موجوں پر چمکتی تو ہے، مگر ساحلِ عافیت کو پیش نظر نہیں کر سکتی۔

وہ خوشی و مسرت کی ساعتیں، جن کو گم ہوئے ایک مدت گذر گئی تھی، وجودِ محبوب کے نظارہ کے ساتھ ہی بیتابانہ صورت سے اُس کے دل و دماغ میں پھر داخل ہوتی ہیں، لیکن

افسوس، یہ فوری خیال کہ اُس کی روح ذلت و ضلالت کی گمراہیوں میں جا پڑی ہے، اور وہ خبیثانہ افعال کی رازداری کا عہد کر چکی ہے، زلیخا میں دیوانگی کی سی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ایک لرزشِ روح کے ساتھ اِن زنجیروں کی بندشوں کا احساس کرتی ہے اور اُس پر شدتِ نزع کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، مگر بایں ہمہ اُمید کی جھلک بھی کبھی کبھی نمودار ہو جاتی ہے، اور گرم آنسوؤں کا ایک سیل، جو اِس کے دل پر عرصہ ہوا برف کی طرح جم کر رہ گیا تھا، چشموں کی طرح جاری ہو جاتا ہے۔

زلیخا کی طلبی کا پیغام آتا ہے کہ مقنع کے حجرۂ عبادت میں حاضر ہو۔ یہ وہ غرور آفریں پیغامِ طلب ہے جس کے سُننے کے لئے حرمِ حُسن کی ہر خاتون (سوائے زلیخا کے) سراپا شوق و انتظار بنی رہتی ہے، مگر غمگین و مغموم زلیخا سہم کر رہ جاتی ہے۔ مقنع کی یہ عبادت گاہ چھوٹے سے پُر فضا چمن میں، کنارِ آب واقع ہے، جہاں وہ شام کے بعد داخل ہوا کرتا ہے، اور اِس خلوت کدہ میں کبھی کبھی کسی دوشیزہ کو جانے کا فخر نصیب ہو جاتا ہے۔

کچھ زمانہ سے زلیخا کے علاوہ کسی نازنینِ حرم کو یہ فخر قربت حاصل نہ ہوا تھا، اُس اولین شبِ عہد کے بعد جب اِس مکان میں وہ نامقدس الفاظِ حلف گونجے تھے، جن کے زیرِ اثر زلیخا قطعاً اور ابداً مقنع کے حکم و اشارہ کی کنیز بن چکی تھی، خادع و مکار پیغمبر ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی روح کو بے نقاب کر چکا تھا، اور ایسے ناپاک و وحشیانہ کلمات اُس کی زبان سے نکل چکے تھے، جن سے زلیخا کو نہایت خوفناک اندیشے پیدا ہو گئے تھے، تاہم شوق و تمنا کے جوش اور عظیم کی روشن پیشانی کے تصور نے (جس کی رونق زلیخا کے خیال میں ہنوز مرتسم تھی) اس کو بالکل مایوس نہ ہونے دیا تھا اور وہ سمجھتی تھی کہ جب اِس کی روح ان مصائب سے گذر کر اور زیادہ صاف و پاکیزہ ہو جائے گی، تو عظیم اسکو ملجائے گا اور اُسکے پُر محبت آغوش میں پہونچکر اِن تکالیف کی کافی تلافی ہو سکے گی۔

مضمحل و ملول زلیخا شام کے جھٹپٹے میں، مقنع کے محلِ عبودیت کی طرف جا رہی ہے، مقنع اپنے شیطانی عزائم میں اس درجہ محو ہے کہ وہ اپنے صیدِ زبوں کی حالتِ غمگین بھی نہیں معلوم کر سکا، وہ مطلق نہیں سمجھ سکا کہ زلیخا جو اِس سے قبل اک پری کی طرح اُڑتی

ہوئی داخل ہوا کرتی تھی، کیوں سوگوارانہ چل رہی ہے، اور اب اس کی نگاہ میں وہ بات کیوں نہیں ہے جو اپنے چاروں طرف کی فضا کو ملتہب و تپاں بنا دیا کرتی تھی؟

مقنع ایک تخت پر، نقاب ڈالے ہوئے لیٹا ہوا ہے، فانوس روشن ہیں اور اُن کی روشنی میں ایک خاص نرمی پائی جاتی ہے۔ اُس کے قریب ایک کتاب اور تسبیح رکھی ہوئی ہے، اور پاس ہی چند صراحیاں اور پیالے نظر آتے ہیں، جو طلائی رنگ کی شراب انگور، شیراز کی آتشِ سیال سے لبریز ہیں، اور جس میں سے اسکے مستور ہونٹھ وقتاً فوقتاً جرعہ کشی کرتے رہتے ہیں۔

جرعہ کشی اور اپنی تجاویز میں وہ اس قدر منہمک ہے کہ زلیخا کے قریب پہونچ جانے پر بھی اس کو خبر نہیں ہوتی اور وہ اپنے تسلسلِ خیال میں ایک خندۂ مکروہ کے ساتھ خود بخود کہنے لگتا ہے:-

"ظالم انسان تیرا بہترین مصرف نارِ جحیم کا روشن رکھنا ہے، تو اس درجہ ذلیل ہے کہ دنیا میں تجھے دخل نہ ہونا چاہیئے، اور اُس پر تو طلبگارِ نعیم ہے! تو خدا کے مجسمے بناتا ہے، اور ان کو خدا سمجھتا ہے! تو خوفناک اور کریہ المنظر جانوروں کو معبود سمجھتا ہے! اے ضعیف مخلوق، جس کا مدارِ حیات محض تنفس پر ہے، اے مٹی کے کھلونے، جس کو شیطان نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، عنقریب میرا قدم تیری دغاباز نسل کی گردنوں پر ہوگا، اور میں شدتِ نفرت و کثرتِ غضب کے ساتھ اپنی ذلت کا انتقام لوں گا! وہ ذلت جس کو میں مدت سے برداشت کر رہا ہوں، وہ نفرت جس کی میں عرصہ سے پرورش کر رہا ہوں۔ ہاں میں ذلیل ہوں کہ انسان کہلاتا ہوں اور وقت آگیا ہے کہ میں ذلیل و کمزور انسان ہی کو اپنا آلۂ کار بنا کر اس ملعون نسل سے اپنا انتقام لوں!

وہ گمراہ انسان جو اپنے تئیں حکیم و فیلسوف کہوا تا ہے، ایک ویران راستہ کی تلاش میں ہے اور اس چور کی طرح جو مردوں کی ہڈیوں کی چمک کو اپنا بہترین راہنما سمجھتا ہے یہ توہم پرست گروہ بھی مستقبل کی دھندلی روشنی

میں دولت و عزت ڈھونڈھتا ہے۔ سنجیدہ بے وقوفو! میں جانتا ہوں کہ تمہاری عقل و حکمت قطعاً بیکار ہے۔ میری تاب ضبط کے لئے ہنسی کا روکنا دشوار ہوگا جب مظفرانہ طبل کی آوازوں میں، میں اُن غلامان عاقل کے خطبات و مواعظ کی تغلیط کروں گا۔ ان عقلاؤ حکمائے کے جو بدترین انبوہ ہیں، اختبارات و حکمت کو خرید لوں گا۔ اُن کی دانائی و فراست سمٹ کر ایک باریک نقطہ بنجائے گی، جس کو میں اپنی خنجر کی نوک سے ڈھک لونگا!

غیر معتبر و مصنوعی مذاہب پر ایمان لے آنے والو! اپنے اوہام پر آنکھیں بند کر کے اعتقاد لے آنے والو! اپنی ارادت مندیوں کی بیہودگیوں سے آسمانوں کو چھپا دینے والو! تمہارے لئے ویسے ہی معجزات بھی مہیا کئے جائیں گے، جو دیکھے جاسکیں گے، سُنے جاسکیں گے، اور آزمائے جاسکیں گے۔ تمہارے مبلغین، جن کے جوشِ عقیدت کی شدت کا یہ حال ہے کہ جس چیز کا وہ وعظ کرتے ہیں اس کی حقیقت سے بمقدار یک ذرہ بھی آگاہ نہیں، تمہارے غازی، جو اس صداقت کو جس پر وہ اپنے خون کا آخری قطرہ نثار کر دینے کے لئے آمادہ و طیار ہیں، اپنی فہم سے بہت بلند و بالا خیال کرتے ہیں، اور تمہارے امام و علمار جو سوا حل آوا کے اُن پیشوایانِ مذہب کی مانند ہیں جو سنگِ خام کو اس لئے فروخت کرتے ہیں کہ اُن سے بُت طیار کئے جائیں۔ ہاں، ان سب کے سامنے رازہائے سربستہ پیش کئے جائیں گے، ان کے روبرو مکر و فریب کے مقدس پتھر ڈالدئے جائیں گے، تاکہ یہ غلامانِ دنیا اُن سے اپنا سر پھوڑا کریں۔ ہاں تمہارے لئے، اے مٹی کے سردارو! خلدِ بریں بھی مہیا کی جائے گی۔ اے ارواح سادہ! تمہارے لئے ایک شاندار بہشت بھی طیار کی جائے گی۔ کیونکہ ایک پیغمبر، اپنی دعوت صداقت کو زندہ نہیں رکھ سکتا، جب تک وہ کوئی ایسا وعدہ نہ کرے، جو ہر مذاق و ہر طبیعت کے لئے موزوں و مناسب ہو، وہاں نوجوانوں کے لئے حوروں کا ہجوم اور عام لوگوں کے لئے

عشرت و نشاط کی کثرت و زیادتی بھی ضروری ہے۔ اے بیہودہ کار مستیو!
تم نہیں سمجھتے کہ ہر شخص کی جنت و دوزخ خود اُس کے داعیات کے مطابق
ہوتی ہے۔!

'آہ میری برباد شدہ روح'، لرزہ براندام زلیخا کے مُنہ سے مضطربانہ ایک چیخ
جاری ہو جاتی ہے۔

مقنع گھبرا جاتا ہے، ہر چند کہ اُس کے لئے خوف و خطر وضع ہی نہ ہوئے تھے، تاہم
اُس کے لئے یہ غمناک الفاظ جو اِس وقت اُس نے سُنے بہت خوفناک تھے۔ کیونکہ
زلیخا کے مُنہ سے، جس کی مسرت کو اس وقت تک کوئی شے دھندلا و افسردہ نہ کر سکی تھی،
ایسی آواز کا نکلنا اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

'آہا، میری محبوب جمیلہ'، دغا باز مقنع اپنی برجستہ مکاری کو کام میں لا کر اُسکے
خیر مقدم میں کہتا ہے۔ 'تو ہے؟ جس کے تبسم کی گلابی شعاعیں تیرے پیغمبر کے
خوابوں کی رسائی سے باہر ہیں۔ اے ماہتابِ ملت، اے تو وہ، جو جوشِ
مذہبی کو محبت کی سرگرمیوں سے ممزوج کر دیتی ہے، اور لوگ تمیز نہیں کر سکتے
کہ وہ اِن دونوں جذبوں میں سے کس کے زیر اثر ہیں، اور نہیں سمجھ سکتے کہ اِن دونوں
میں سے کس کی آرزو کریں؟ آیا اُن جنتوں کی جن کا وعدہ اُن سے کیا گیا ہے،
یا تیری، جو خود اک مستقل فردوس ہے! اگر تو نہ ہوتی تو میں کیا تھا؟ تیرے
بغیر میری طاقتِ عظمت پر اداسی چھائی ہوتی، اور میرے فتوحات میں کوئی
خوشی نہ ہوتی۔ میرے جھنڈوں کے حامل اگر فرشتے بھی ہوتے تو اُن میں یہ سماویت
کبھی پیدا نہ ہو سکتی، اگر اُن پر تیرے تبسم کی ضیا پاشیاں اثر نہ ڈالتیں۔ لیکن یہ
غمگینی کیوں ہے؟ تیری آنکھیں جن سے شب گذشتہ تک زندگی برستی ہوئی
نظر آتی تھی اِس وقت اُن کی رعنائی کیا ہوئی؟ میں جانتا ہوں کہ آج دن کے
تکان نے انھیں مضمحل کر دیا ہے، اور انھیں پھر روشن کئے جانے کی ضرورت
ہے۔ جو چیز میں تجھے دیتا ہوں آفتاب کے پاس بھی نہیں ہے، شہابِ ثاقب

بھی چشمہ نور سے یہ رونق نہیں لا سکتا۔ اِس پیالہ میں یہ نہ خیال کر کہ مائیاتِ عالم میں سے کوئی شے ہے، نہیں بلکہ یہ عالم بالا کی، نہر سلسبیل کا (جس کی تہ عقیق و زبرجد کی ہے) زُلال ہے۔ ہر شب میرے موکل اِن برتنوں کو اِس مقدس پانی سے بھر جایا کرتے ہیں، آج تو بھی اس شراب مطہر سے کامراں ہوگی۔ لے، پی جا! اِس کے ہر قطرہ میں اک تازہ روح پنہاں ہے، جو تجھے سراپا شعلہ اور تیری آنکھوں کو یکسر نور بنا دے گی۔ اس کو پی، کیونکہ آج میں تیرے تبسم کی نشوہ بخشیوں کا امتحان لینا چاہتا ہوں۔ تو جانتی ہے کہ آج ایک نوجوان آیا ہے۔ کیوں؟ تو گھبرا کیوں گئی؟ ہاں معلوم ہوتا ہے تو نے بھی اس کو دیکھ لیا ہے۔ تو نے دیکھا وہ کس قدر عالی شان معلوم ہوتا ہے! یہ جوان آسمانی جنتوں میں تیرے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ ہر چند میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ اس کے خیالات، محبت کی طرف سے نہایت خشک و درشت ہیں۔ مگر اس پر تجھے فتح حاصل کرنی ناگزیر ہے۔

اے حسینہ! احتراز نہ کر، تو آسمان کے رازہائے سربستہ کو نہیں سمجھ سکتی فولاد کے لئے اس سے قبل کہ وہ طیاری اسلحہ کے واسطے کارآمد ثابت ہو کر، کسی بہادر کی زیبائش دوش و کمر ہو سکے، آگ میں تپایا جانا ناگزیر ہے آج کی شب، میں حسن و جمال کی سحرکاریوں کا تجربہ اِس نوجوان پر کرنا چاہتا ہوں، میرے حریم مقدس کا مایۂ ناز نمونہ ذہانت و شباب، پیکر فرزانگی و حُسن جس کی نفاست و عدیم المثالی مسلم ہے، اِس نوجوان کو رام کرے گا۔

نشۂ شباب سے مست رہنے والی آنکھیں، جن پر خمار آلود پپوٹے اس طرح جھکے رہتے ہیں، جیسے بنفشہ کے پھولوں پر برف کی ہلکی چادر، تابناک رخسارے، جن کی حرارت ایسی محسوس ہوتی ہے جیسے بہار میں صبح نکلنے والے آفتاب کی، لبہائے نازک، جو اپنے مس میں وہی کیفیت رکھتے ہیں جو مُہر سلیمان میں پائی جاتی تھی، وہ خرام ناز، جس سے موسیقی کے بہترین نغمات سیکھے

جا سکتے ہیں، اور تمام وہ لطافتیں اور دلربائیاں جو کسی بہشت میں پائی جا سکتی ہیں، میرے نئے معتقد کیلئے درکار ہیں، تاکہ اُس کے قلب کو نرم کر کے مذہب کی مُہر کو زیادہ آسانی و استحکام کے ساتھ اس پر ثبت کر سکیں۔ پھر اے زلیخا، سن! اگرچہ میرے حرم کی ہر دوشیزہ اپنے اندر کوئی نہ کوئی مخصوص اندازِ دلربایانہ رکھتی ہے ان کی ہر ہر ادائے نگاہ، آئینہ کے مقابل آزمائی گئی ہے۔ لیکن میں ایک ایسی نازپرور اور غمزہ طراز حسینہ چاہتا ہوں، جس کی ہر ادا سحر پرور اور جس کا ہر عشوہ ایک مستقل افسوں ہو۔ ایک ایسی دوشیزہ چاہتا ہوں، جس کی تمام ادائیں، اور جس کی تمام دلربائیاں ایک مرکز سے ہو کر گذریں اور اس جوان کے دل کو مسحور کر لیں۔ ہاں، آج مجھے ایک ایسی ہی پرجمال اور فتنہ پرداز نازنین کی ضرورت ہے، اور ایسی ہستی، زلیخا تو اور صرف تو ہو سکتی ہے!

زلیخا کے پنجہ ہائے نگارین ایک دوسرے میں پیوست ہو جانے کے لئے بڑھتے ہیں، اس کے ہونٹوں کی سُرخی زردی سے بدل جاتی ہے، وہ ششدر و سراسیمہ کھڑی، نقاب پوش مقنع کو دیکھ رہی ہے۔ لیکن مقنع نے جو کچھ کہا تھا وہ اس اعتماد کے ساتھ تھا کہ گویا زلیخا اس غصہ معصوم کے علامات اُسنے دیکھے ہی نہیں تھے۔

جسوقت سے مقنع نے اپنی تقریر شروع کی تھی، زلیخا کی حالت بدلتی جا رہی تھی، اور مقنع اس تغیر کو محسوس کرنے کے بعد بھی تجاہل سے کام لے رہا تھا۔ لیکن جب اس نے کہا کہ تو اور صرف تو ہو سکتی ہے! تو زلیخا بے اختیار ہو کر چیخ اٹھی کہ:۔

"یہ کبھی نہ ہو سکے گا! خدایا کیا میری تقدیر یہ ہے؟ کیا میری تمام آرزوئیں، آسمانی برکتوں کے تمام خواب، میری عفت کوشیاں اور میرا افتخار، یہ سب اس لئے ہیں کہ میں ایک شیطانِ مجسمہ کا آلۂ خباثت بنوں؟ اس کی معصیت کاری کا حیلہ بنوں؟ کیا میرا مقدر یہ ہے کہ میں نہ صرف خود بلکہ دوسروں کو بھی قعرِ ذلت

سے کے جہنم آسا طوفانِ آتشیں میں غرق کروں؟ اور دوسرا ابھی کون، جو آج ہی آیا ہے! آہ کیا میں اُسکے عشق میں فنا نہیں ہو چکی ہوں؟

مقنع:- خبردار! اے ہذیانِ مجسم، ہوش میں آ! وقت سے پہلے ہوشیار ہو جا۔ ایسی بات مُنہ سے نہ نکال، جس کا سُننا میں تیرے منہ سے بھی کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ جا اپنے رباب، اپنے لحنِ دلنواز کا جادو اُس جوان پر آزما۔ میں تیرے اس شعلۂ غیض کو بھی پیار کرتا ہوں، جس نے تیری آنکھوں کو پھر تابناک بنا دیا ہے۔ اگر یہ نوجوان تیرے محبوب سے (جو مر چکا ہے) مشابہ ہے تو یہ بات تیری کامیابی میں اور زیادہ معاون ہو گی۔ غصہ کو دُور کر۔ تیری آنکھیں محبت کا مسکن ہیں، غصہ کا نہیں۔ میرا حکم مانا جائے گا!

زلیخا:- حکم مانا جائے گا؟ ہرگز نہیں! بے شک میں ہر لعنت کی مستحق ہوں، لیکن عظیم، شجاع و وفادار، حسین و جمیل عظیم! کیا اُسے بھی برباد ہو جانا چاہیئے؟ کیا اُسے بھی گمراہ و بے دین بنایا جائے؟ نہیں، میں اُسے تباہی کی طرف کبھی دعوت نہیں دوں گی۔ وہ پیکرِ صداقت ہے، تمثالِ پاکیزگی ہے، اُسے کبھی برباد نہ ہونے دوں گی۔ اے شیطانِ رجیم، تیری ساحرانہ مکاریوں کا جہنمی پیالہ اُسے راغب نہیں کر سکتا، تیری نجس جنت کی رہنے والیاں اپنی عشوہ فروشیوں سے اسکے دل کو نہیں لُبھا سکتیں، کیونکہ اسکا دل عشق کے جذبۂ مقدس سے معمور ہے، اور وہ اس بے حیائی و بے غیرتی کے حملے کی کامیاب مدافعت کر سکتا ہے۔ گو میں تیری کارگاہِ مکر و فریب میں مبتلا ہوں، مگر اب بھی اُس کی دل کی ملکہ ہوں، اور اُسی طرح پاک و بے عیب حکمرانی کرتی رہوں گی، جس طرح محبت کے اولین موسمِ بہاراں میں کرتی تھی، اور ہر چند میں خود تباہ و برباد ہوں، لیکن میں اُس کا محافظ فرشتہ ہوں۔ اے کاش اُسے علم نہ ہو کہ جس پیشانی کا اُسنے الوداعی بوسہ لیا تھا آج کس درجہ پست و ذلیل ہے، وہ کبھی نہ جانے کہ وہ ہستی جس کے ساتھ وہ کبھی محبت کرتا تھا، اور اب بھی دیوانہ وار چاہتا ہے کسقدر مکروہ و مبتذل

ہے! موذی، تو ہنستا ہے، تو مجھے اس کے سامنے رسوا کرے گا، میرے نام پر داغ لگانا چاہتا ہے؟ یہ بھی کر دیکھ! وہ کسی ایسی بات کو جس سے اس کی زلیخا کی توہین و تذلیل ہو، قیامت تک باور نہ کرے گا۔ میری پاکیزگی اُسکے دل میں منقوش ہے، اور وہ سمجھتا ہے کہ خدا کی سقفِ نیلی کے سایہ میں مجھے کوئی شے تبدیل نہیں کر سکتی۔ آہ، میں بھی اپنی نسبت کبھی ایسا ہی یقین رکھتی تھی، مگر اب وہ محض خواب و خیال ہے۔ میری زندگی کیسی ہی خراب کیوں نہ ہو جائے، لیکن مجھے یہ بھی گوارا ہے، اگر وہ اس کو نہ جانے۔ میں دنیا کے کسی ایسے گمنام گوشے میں جا چھپوں گی جہاں میری زندگی میں آفتاب کی روشنی بھی مجھے نہ دیکھ سکے گی۔ جہاں مجھ سے کوئی سوال کرنے والا نہ ہوگا۔ اور جہاں میں اپنی گمنام اور افسردہ ہستی کو فنا کر دوں گی، اور تو اے ملعونِ رجیم (جس نے اپنی خباثتوں کی تباہ کن اور ناپاک آگ میں میری روح و جسم کو جلا دیا ہے، اور مجھے مردود و ملعون بنا کر میری زندگی کو عذابِ دوام میں تبدیل کر دیا ہے اور اب اپنی ابلیسانہ حکمتوں سے اُسے اور وسعت دینا چاہتا ہے) جب میں اس ناپاک فضا سے دفع ہو جاؤں تو - - - - - - - - - - -

مقنع:- بس! بے خطر دیوانی، خاموش! میرے غصہ و غضب کو مشتعل نہ کر۔ خدا جانتا ہے، اتنی بے خوف تو وہ حقیر چڑیا بھی نہیں ہوتی، جو اپنے تئیں ایک مگر کے کشادہ جبڑوں کے اندر ڈال دیتی ہے! کیا تو فی الواقع یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہے، ان اچھوتے محلاتِ حرم کو جہاں تو دربارِ عشق اور بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہو کر، ملکہ کی سی زندگی بسر کر رہی ہے، ترک کر دینا چاہتی ہے؟ یاد رکھ! میرے پنجے سے نکلنا تیرے لئے اُتنا ہی آسان ہے جتنا کہ حشرات الارض میں اُس کیڑے کے لئے جس پر ایک زہریلا سانپ اپنی نظریں جما چکا ہے۔ جو چیز مقدر ہو چکی ہے خواہ نیک ہو یا بد اس کا بدلنا کیونکر ممکن ہے؟ تو تا زیست میری ہے اور تا بہ مرگ مقنع کی معشوقہ رہے گی۔ کیا تو اپنا عہد اپنا قول بھول

گئی۔؟

ہرچند کہ زلیخا کے لئے اب کوئی امید باقی نہیں رہ گئی تھی، اس کی مایوسیاں مکمل ہو چکی تھیں اور وہ نوشتۂ تقدیر پر شاکر بھی نظر آتی تھی، لیکن اس وقت مقنع کی ذلیل و بیہودہ طعن و تشنیع سے اس کی روح یکسر اضطرار بن گئی، اور مقنع کے تنفس کی سمیت نے جو حقیقتاً ایک برقِ جانسوز تھی، اسکے چہرہ پر موت کا غازہ مل دیا۔

مقنع:- میری عروسِ پیماں بستہ! تمام دوشیزگانِ حرم صرف اپنے اپنے حجلوں کو مقامِ عروسی سمجھتی ہیں، لیکن تیرا مقامِ عروسی تو وہ خاص حجرہ ہے جہاں مجھپر اسرارِ غیب نازل ہوتے ہیں اور جس کے دروازوں پر خوفناک روحیں پہرا دیا کرتی ہیں۔ جس وقت ہمارا عقد ہوا تھا موت کی شمعیں جھلملا رہی تھیں، اور نیک روحوں کا ہجوم، جو اپنے زمانہ میں غیر فانی ہستیاں تھیں، ہمارا جلوسِ نکاح تھا، اور وہ اپنے نورانی کفن پہنے ہوئے ہمارے شریکِ عقد ہوئے تھے۔ اے ملکہ، رعشہ براندام کیوں ہے؟ کیا میرے نہاخانۂ خاص کی شرابِ رنگین کا وہ جام، جسپر ہمارا عہد و پیمانِ عقد باندھا گیا، جس نے تجھے میرا پابند کر دیا، جس نے تیری روح اور تیرے جسم کو میری ملکیت کر دیا، بہت تلخ تھا؟ اک مضبوط زنجیر تیری ہستی کو جکڑے ہوئے ہے۔ اب وہ متبرک ہو یا منحوس، اس گرہ کو تو آلاتِ دوزخ بھی نہیں کھول سکتے۔ پس زلیخا، اب تو حرم میں جا اور خوش و خرم نظر آ۔ اور یہ حزن و ملال کا رنگ دور کر دے۔ ہاں ذرا ٹھہر۔ ایک بات اور! آج کی رات جو واقعہ گذرا اس سے میں سمجھتا ہوں کہ بالآخر میرا راز تجھ پر روشن ہو گیا ہے، تو اب سب کچھ جانتی ہے اور مجھے میری حقیقی روشنی میں جانتی ہے۔ اے پُرجوش لڑکی کیا تو نے ہر بات کو صحیح اور ہر چیز کو واقعی تصور کر لیا تھا؟ تو نے یقین کر لیا تھا کہ میں نوعِ انسان سے محبت رکھتا ہوں، یہ اب بھی صحیح ہے، مجھے نسلِ انسان کیساتھ ہمدردی ہے میں اس سے محبت رکھتا ہوں، مگر وہ ہمدردی محبت جو ایک شکاری اپنے شکار کیساتھ ہوتی،

ہے۔ اب جبکہ تو میری اندرونِ روح کے ایوانِ ملکوتیت کو دیکھ چکی ہے، وقت آگیا ہے کہ یہ شکل و شباہت بھی تیرے سئے نقاب کے اندر نہ رہے۔ یہ پیشانی جس کا نورِ سماوی تیری برگزیدہ آنکھوں کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے، یہ چشمِ سحر آگیں جس کی مخفی طاقتوں کے سامنے تو نے دیکھا ہے کہ لرزہ براندام انسان کس طرح جبینِ عبودیت جھکا دیتا ہے، تیرے لئے لمعہ پاش ہو جائے۔ ادھر مڑ، اور دیکھ! اگر تو پھر بھی متحیر ہو تو ہو، کہ میں قدرت کے اُن ستم ایجاد و ستم ظریف ہاتھوں سے، جنہوں نے مجھے ایسا بدہیئت اور کریہ المنظر بنا کر اس دُنیا میں بھیجا، کیوں متنفر ہوں؟ اور میں نے کیوں گناہ کو ذریعہ انتقام بنایا ہے؟ اگر تیری قوتِ فیصلہ اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ میری کراہیت میں ذرہ برابر بھی اضافہ کر سکتی ہے، تو اپنا شدید ترین فیصلہ بھی صادر کر کے دیکھ لے!"

یہ کہتے ہوئے مقنع اپنا نقاب الٹ دیتا ہے۔ زلیخا آہستہ آہستہ مُڑتی ہے۔ اس کی نظر مقنع کے چہرہ پر پڑتی ہے اور خوفناک چیخ کے ساتھ بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑتی ہے۔

یہ فسانہ یہیں تک بیان ہوا تھا کہ لالہ رُخ پر نیند کا غلبہ ہوا، اور بادل ناخواستہ مثنوی کو ناتمام چھوڑ دیا گیا۔ صبح ہوتے قافلہ شاہی روانہ ہوا۔ اور شام کو جب منزل پر پہنچا تو ایک عجیب سماں پیشِ نظر تھا۔

درختوں کے جھنڈ، ابریشمی قندیلوں سے آراستہ کئے گئے تھے، جن کے لئے ایک چینی صناع خاص طور سے بھیجا گیا تھا۔ شاہزادی کے قیامگاہ کے چاروں طرف اور تمام راستوں میں بانس کی دیواریں اور دروازے طیار کر کے عجیب و غریب صناعی سے کام لیا گیا تھا، جس سے ہر چیز نہ صرف مستقل اور حقیقی نظر آتی تھی بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ دہلی کے محلات اس مقام پر منتقل کر دئے گئے ہیں، اور اُن کے گنبد و مینار، محرابیں اور کلس رنگین روشنیوں سے منور ہیں۔ درختوں کی ٹہنیوں میں قمقموں کی وجہ سے تمام منظر پر ایک طلسمی کیفیت پیدا تھی اور

یہ حصۂ زمین پریوں کے رہنے کی جگہ معلوم ہوتا تھا۔

شاہزادی لالہ رخ، عظیم و زلیخا کے دردناک فسانہ سے کچھ اس درجہ متاثر تھی کہ وہ اپنے دماغ کو مشکل سے کسی اور بات پر صرف کر سکتی تھی۔ اور اگر اُس کے ذہن میں کچھ جگہ باقی ہو سکتی تھی تو وہ فسانہ گو کے حصہ میں آ چکی تھی۔

چینی صناع کی بدقسمتی تھی کہ شاہزادی نے اس کے اظہارِ فن سے دلچسپی نہ لی، اور بعجلت خیمہ شاہی میں داخل ہوگئی۔ فضل الدین بھی بمجبوری شاہزادی کی مشائعت میں خیمہ کے اندر داخل ہوگیا، مگر اُسے افسوس تھا کہ شاہزادی نے اس نمایشِ صنعت اور منظرِ چراغاں سے کوئی لطف نہ اُٹھایا۔

نوجوان فسانہ گو فوراً طلب کیا گیا، اور قبل اس کے کہ فضل الدین کسی بات یا سوال میں وقت ضائع کرتا، شاہزادی نے فسانہ کا باقی حصہ سنائے جانیکا حکم دیا۔

(باقی دارد)

غالب

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بہ شمارِ دلبری — در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آزری

تا بُوَد بہ لطف و قہر، ہیچ بہانہ درمیاں — شکر گرفت نارسا، شکوہ شمرد سرسری

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بہرہِ تو روئے نیست — در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

حیف کہ من بجز تہیم وز تو سخن رود کہ تو — اشک بدیدہ بشمری، نالہ بہ سینہ بنگری

فیضِ نتیجۂ ورع از مے و نغمہ یافتیم — زہرہ ما بریں افق دادہ فروغِ مشتری

دردِ ترا بوقت جنگ قاعدۂ تہمتنی — فکر مرا بزیرِ زنگ آئینہ سکندری

بسکہ ز گدازِ دل در جگر آتشے چو سیل
غالب، اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیرِ من بری

تخمیس کلام غالب

(از سید کلب احمد صاحب مانی جائسی)

جناب، متفق اس سے تو خانہ زاد نہیں | کہ ہجرِ دوست قیامت کی روداد نہیں
مگر میں حشر سے منکر ہوں، یہ مراد نہیں؟ | نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

فلک کے جی میں کچھ آج امتحان کی آئی ہے | ذرا سی دیر کی یہ صبر آزمائی ہے
اُداسیوں کی گھٹا کیوں دلوں پہ چھائی ہے؟ | کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے
بلا سے دن کو اگر آج ابر و باد نہیں

یہ حکم ہے کہ انھیں دشمنِ وفا نہ کہیں | عدوئے جان و دلِ اہلِ مدعا نہ کہیں
مگر یہ حال ہو، اُنکا تو لوگ کیا نہ کہیں | جو انکے سامنے آؤ تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو، تو خیر باد نہیں

میں کیا بتاؤں کہ کیوں اشک خوں یہ بہتے ہیں؟ | ہزار طرح کے غم اہلِ عشق سہتے ہیں
یہ رو رہا ہوں کہ یونہی تو بہلاتے رہتے ہیں | کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

مبارک اوروں کو امید اجر یوم حساب | مبارک اوروں کو دن بھر کا صوم اور ثواب
یہاں نہ مے کی کمی ہے، نہ تشنگی کا عذاب | علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

نہ چھیڑ تذکرۂ دفعِ گردشِ ایام — خوشی کا نام نہ لے ہم ہیں خوگرِ آلام
نصیبوں ہی میں ہی جب دُکھ تو پھر کہاں آرام — جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہمکو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

نہ مبتلا کرو کاہش میں جان کو غالبؔ — بس اب سکوت میں مانی کا ساتھ دو غالبؔ
امیدِ عیش میں کیوں رنج مول لو غالبؔ — تم اُنکے وعدہ کا ذکر اُنسے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

آرزو

(اثر:- مخمور اکبرآبادی)

میری ہر صبح تیری یاد کے ساتھ شروع ہوتی ہے، ہر شام اسی خیال میں بسر ہوجاتی ہے اور رات کی پوشیدہ تنہائیوں میں بھی مجھے تیرا ہی انتظار ہے۔

شعاعوں کی مسرور دوشیزگی کو میں اپنا محرم بنانے کی ناکام کوشش کیا کرتا ہوں، صرف اس تمنا میں کہ اُن سے تیرا ذکر سنوں لیکن اس عالمِ عصمت و تبسم میں میری ذرا اعتنا نہیں کی جاتی۔

غنچے کے تبسمِ شگفتگی کو میں اکثر دل میں چھپایا کرتا ہوں، صرف اس امید پر کہ اس سے تیرا نشان دریافت کروں، لیکن وہ میری کوئی تشفی کرنا نہیں چاہتا۔

موسیقی کے گداز ترنم میں، میں اکثر اپنی حیات صرف اسلئے تحلیل کردیا کرتا ہوں کہ اس سے تیرا راز دریافت کروں، مگر اس کا نتیجہ ہمیشہ ایک متالم خموشی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

لیکن جب میں مایوس ہوکر اپنے ہی بربطِ شکستہ کے معطل تاروں کو چھیڑنے لگتا ہوں تو کسی بعد عمیق سے مجھے یہ آواز آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے:-

"وہ وہاں ہے جہاں نغمہ کی گداز ترین نوا، درد کی عمیق ترین خلش اور تخیل کی نازک ترین جنبش بھی نہیں پہونچ سکتی، تجھے ابھی اور صبر کرنا چاہیئے"

مگر میں اب بھی دیکھ رہا ہوں کہ تو:-

شعاعستانِ مشرق کی امواجِ زریں میں پنہاں، وہم لطافت و نکہت میں ملبوس، بارشِ سکر و لذات کر رہی ہے اور میں مبہوت ہوں۔

رنگستانِ مغرب کے طلسم اُفق میں، نصف پنہاں، تخیلِ مسرت کی طرح جھل مل جھل مل کر رہی ہے اور میں اس کیف خیرگی سے مسحور ہوں۔

خوابستانِ شب کے سکونِ مطلق میں ایک خوابِ نشاط پرور کی طرح تو میرے وجود کے ذرہ ذرہ سے سکون و طمانیت کھینچ رہی ہے اور میں اس مجسمۂ نور و الوہیت کی پرستش میں متحیر ہوں۔

لیکن جب کبھی اس خوابِ نظارہ سے چونک کر میں یکبارگی چلا اٹھتا ہوں "آ آ میرے انتشارِ حیات میں موسیقی کی سی ترتیب پیدا کردے" تو تو مسکرا کر غائب ہوجاتی ہے! فریبِ آرزو کی عارضی حیات، کا دشستانِ محبت میں، اکثر اپنی سرابی حقیقت آشکارا کرتی رہتی ہے۔

لیکن میں اب بھی تیرا ہی منتظر ہوں!

علومِ اسلامی پر ایک مؤرخانہ نظر

(از: نیاز فتحپوری)

علومِ عرب قبل اسلام

ہر چند ہمیر بر گسٹال (مشہور جرمن مستشرق) کا یہ قول بڑی حد تک صحیح ہے کہ عرب اور عربی لٹریچر کی صحیح تاریخ اسوقت سے شروع ہوتی ہے، جب وہاں آفتابِ رسالت طلوع ہوا، لیکن قاطبتاً اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قبل عہد اسلام، عرب میں کسی علم کا رواج ہی نہ تھا اور "زمانۂ جاہلیت" علمی نقطہ نظر سے بالکل تاریکی و ظلمت میں ملفوف تھا۔

علامہ شہرستانی نے اپنی مشہور تصنیف "الملل و النحل" میں لکھا ہے کہ قبلِ اسلام عرب میں خصوصیت کے ساتھ چار علوم کا زیادہ رواج تھا: (۱) علم الانساب (۲) تاریخ (۳) تعبیر الرؤیا اور (۴) علم النجوم۔

شاہانِ حیرہ و غسان نہ صرف علوم و فنون کی قدر کرتے تھے بلکہ وہ خود بھی شعر کہتے تھے اور ان میں سے بعض بعض اچھے شاعر تھے۔

مُنذر، اپنی سیاسی ذہانت کی وجہ سے، تاریخ میں بہت نمایاں نظر آتا ہے اور اسکے بیٹے عمرو کے دربار میں المتلمس اور طرفہ دو مشہور شاعر رہا کرتے تھے، جن میں سے موخر الذکر معلقات میں سے ایک قصیدہ کا مصنف تھا۔ مُنذر کے جانشین، نعمان نے جس سیر چشمی سے نابغہ اور لبید شعرا کی قدر کی، وہ تاریخ کا روشن واقعہ ہے۔

بنو غسان کا آخری بادشاہ، جبلہ ابن الایہم، جو خلیفہ ثانی کے عہد تک زندہ رہا، اپنے عہد کا مشہور شاعر تھا، اور فرمانروایانِ عرب کی صف میں امرؤ القیس کو جو مرتبہ شاعری کے لحاظ سے نصیب ہوا، اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آج دُنیا میں وہ شاعر کی ہی

حیثیت سے مشہور ہے اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ حیرہ کا تاجدار بھی تھا۔

حیرہ کی تاریخ اٹھاکر دیکھئے تو معلوم ہوگا، کہ فنِ تحریر کو رواج دینے میں یہی رہنمائے اولین تھا، کیونکہ اہلِ حجاز نے اس فن کو حیرہ یا انبار ہی سے حاصل کیا تھا۔ اور پھر جب ایک صدی بعد خلیفۂ ثانی کے عہد میں کوفہ کی بنیاد قایم ہوئی، تو یہ فن وہاں بھی رائج ہوگیا۔ جسے آج بھی کوفی خط سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے قبل اس مسئلہ میں اختلاف تھا کہ عربوں میں فنِ تحریر کا رواج کب سے ہوا اور بعض لوگ اسکی قدامت ثابت کرنے میں بہت مبالغہ سے کام لیتے تھے، لیکن اب یہ واقعہ پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ قدیم ترین عربی تحریریں وہ ہیں، جو عہدِ رسالت سے ایک صدی قبل لکھی گئی تھیں اس سے پہلے کسی تحریر کا پایا جانا اس فن کا رائج ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ قبل اسلام کی جو تحریریں پائی گئی ہیں، اُن میں قصاید کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں، جو اظہارِ تفاخر میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے سامنے پڑھا کرتا تھا۔ اس لئے یہ امر بخوبی ثابت ہے کہ عہدِ رسالت سے پہلے ایام جاہلیت میں، مذاقِ شعری، اعراب میں پوری طرح پایا جاتا تھا، اور سوسائٹی کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا، جو اس سے متاثر نہ ہو۔ چنانچہ قبیلۂ ہذیل کی نظموں کا مجموعہ یا حماسہ وغیرہ کافی شہادت اس امر کی ہے۔

علم الانساب بھی، حسب بیانِ شہرستانی، ان میں رائج تھا، لیکن جہاں تک معلوم ہوتا ہے اس کی طرف پوری توجہ حضرت عمرؓ کے عہد سے ہوئی، جب مجاہدین کی تنخواہیں مقرر کرنے کے لئے اسم نویسی کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اس سلسلہ میں بلاذری کی انساب الاشراف، خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔

علاوہ شاعری اور علم الانساب کے، اہلِ عرب میں، قبل ظہورِ اسلام قصہ گوئی کا بھی کافی ذوق پایا جاتا تھا۔ چنانچہ ابو عبیدہ، عہدِ جاہلیت کے مشہور اور بے نظیر داستان گو سمجھے جاتے تھے۔

عہدِ رسالت و خلفائے راشدین

جب آنحضرت نے تبلیغ اسلام شروع کی، تو جن مصائب کا سامنا آپ کو کرنا پڑا، وہ سب پر ظاہر ہے اور ایسی صورت میں جبکہ لاکھوں افکار آپ کے پیش نظر تھے، علوم و فنون کی طرف کوئی توجہ نہ ہو سکتی تھی، تاہم جب آپ کے پیش نظر کوئی ایسا موقع آیا، تو آپ نے ضرور فائدہ اٹھایا، چنانچہ آپ نے بدر کے قیدیوں کو صرف اس شرط پر رہا کردیا کہ وہ لوگوں کو لکھنا سکھائیں۔ پھر اسکے ساتھ اگر رسول اللہ کی احادیث کو

دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ نے کن کن طریقوں سے لوگوں کو علوم و فنون سیکھنے کی طرف رغبت دلائی ہے۔ رسول اللہ کے بعد خلیفہ اول کا عہد شروع ہوا، لیکن افسوس ہے کہ وہ بہت کم رہا۔ خلیفہ دوم نے نسبتاً طویل زمانہ پایا لیکن آپ کو حکومتِ اسلام کی بنیاد ہی استوار کرنے سے فرصت نہ ملی تھی کہ قدرت نے اس عجیب و غریب ہستی کو اپنے پاس بلالیا۔ خلیفہ ثالث کا عہد بیشک طویل تھا، لیکن آپ کی صداقت اور نیکی سے لوگوں نے اس قدر ناجائز فائدہ اٹھایا کہ آخرکار اندرونِ ملک میں انتشار و افتراق کی آگ مشتعل ہوگئی، جس کی چنگاریاں صدیوں بعد تک تمام اکنافِ عالم میں اُڑتی رہیں۔ خلیفہ چہارم نے باوجود اس کے کہ حد درجہ بدامنی کی حالت میں عنانِ خلافت ہاتھ میں لی، اور حکومتِ اسلام کے دو حصے آپ کے عہد ہی میں ہوگئے، تاہم آپ علم کی طرف سے غافل نہیں رہے اور آپ ہی کے اشارے سے، الاسود الدؤلی نے زبانِ عربی کو صحیح لکھنے اور صحیح بولنے کے قواعد مرتب کئے۔ اس کے بعد خلیل نے علم عروض کے قواعد مرتب کئے اور آخر کار بصرہ و کوفہ مسلمانوں کی ادبی تحریکات کا مرکز ہو کر رہ گئے، جن سے کسائی اور سیبویہ کی مشہور ہستیوں کو کبھی جدا نہیں کیا جاسکتا۔

عہدِ بنی امیہ

عہدِ بنی امیہ کے ساتھ ہی حکومتِ اسلام کا رنگ بدل گیا اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وہ مذہبی حکومت، جو خلفائے راشدین کے عہد میں پائی جاتی تھی، مفقود ہوگئی اور اس کے بجائے دُنیاوی جاہ و جلال کے مناظر ہر طرف نمودار ہونے لگے، لیکن اسی کے ساتھ یہ کہنا کہ بنو امیہ نے ترقی تعلیم و تہذیب کی طرف توجہ نہیں کی حقیقتاً انصاف کا خون کرنا ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ "اسپرٹ آف اسلام" کے مصنف نے کیونکر ایسا غلط الزام بنو امیہ پر لگاکر اپنی عصبیت کو اس بُری طرح سے ظاہر کردینا پسند کیا۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ خاندانِ بنی امیہ کے بعض افراد (مثلاً ولید ثانی، یزید ثالث اور مروان ثانی) ایسے تھے جن پر یہ الزام عاید ہوسکتا ہے، لیکن کیسا صریح ظلم ہے کہ ان بعض افراد کے حال پر قیاس کرکے سارے خاندانِ بنی امیہ کی نسبت تو یہ حکم لگادیا جاتا ہے لیکن خاندانِ بنی عباس میں (جس کی علم پروری کے افسانے اسقدر مشہور ہیں) مستنجد اور مقتدر کے واقعات کو پیش نظر رکھکر سارے خاندانِ عباسیہ کو علم و تہذیب کا دشمن قرار نہیں دیا جاتا۔

امیر معاویہ، جو خاندانِ بنی امیہ کے مؤسسِ اولین ہیں (اُن کی نسبت خواہ کوئی کچھ ہی کیوں نہ کہے) لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ بڑے دل والے اور سیر چشم آدمی تھے آپ نے اپنی مسیحی رعایا کے ساتھ جس سلوک کو روا رکھا اگر اس کو بازنطائن فرمانروایان کے طرزِ عمل کے ساتھ ساتھ ملا کر دیکھا جائے، تو معلوم ہو سکتا ہے کہ امیر معاویہ کس قدر فراخ دل رکھتے تھے۔ دُنیا کو معلوم ہے کہ آپ ہی نے ایک مسیحی طبیب ابن اثل کو اپنے دربار میں بلا کر حکم دیا تھا کہ طب کی کتابیں، عربی میں ترجمہ کرے اور آپ ہی نے عابد کو صغار سے طلب کر کے مجبور کیا تھا کہ وہ شاہانِ یمن کی تاریخ کو ایک جگہ کتابی صورت میں محفوظ کر دے۔

امیر معاویہ کا بیٹا اور جانشین، یزید بھی اچھا شاعر تھا اور شعراء کی قدر کیا کرتا تھا اور خالد ابن یزید کو تو علوم کی طرف خاص شغف تھا چنانچہ اُس نے متعدد آدمی متعین کئے تھے کہ وہ مختلف کتابیں، عربی زبان میں منتقل کریں اور اگر ابن ندیم اور ابن ابی عصیبیہ کی روایت پر اعتماد کیا جائے، تو خالد کے اکتسابات علمیہ کا درجہ بہت بلند نظر آتا ہے۔

عمر ابن عبد العزیز، مصر کے گورنر ہی تھے کہ یونانی علوم کی طرف آپ کو توجہ ہوئی، چنانچہ ابن ابجر سے جو اسکندریہ میں یونان کے علوم فلسفیہ کا بہت بڑا ماہر تھا، آپ نے ملاقات پیدا کی اور یہ مراسم اس حد تک مستحکم ہو گئے کہ جب آپ خلیفہ ہوئے، تو ابن ابجر کو سارے محکمۂ حفظانِ صحت کا منتظم بنا دیا۔

ابن ابی عصیبیہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی کے عہد میں یونان کے بہت سے علوم و فنون مصر سے انطاکیہ اور حرّان میں منتقل ہوئے اور وہاں سے دیگر بلادِ اسلامی میں۔

ہشام بن عبد الملک، اک اعلیٰ درجہ کا محارب ہونے کے ساتھ ہی جیسا قابل و فاضل خلیفہ تھا، وہ تاریخ کا روشن واقعہ ہے۔ اُسکا وزیر یا کاتبِ خصوصی وہی سالم تھا جو اپنے عہد کا بڑا مشہور زباندان تسلیم کیا جاتا تھا اور جسنے ارسطا طالیس کی متعدد کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کیا۔ سالم کے بیٹے جبلہ نے بھی متعدد تاریخی کتابیں فارسی سے عربی میں ترجمہ کیں۔

ابن ندیم نے بیان کیا ہے کہ اکاسرۂ عجم کا جو علمی خزانہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا، اس میں ایک تاریخ ایران بھی تھی جو نہایت بسیط و مفصل ہونے کے علاوہ مصوّر بھی تھی، چنانچہ خلیفہ ہشام نے

سنہ ۱۱۳ھ میں اسکا ترجمہ عربی میں کرایا۔ جسے مسعودی نے خود بمقام اصطخر ۳۰۳ھ میں دیکھا تھا۔

عبد القاسم حماد، جس کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اس نے ایک بار ایک نشست میں ۲۹۰۰ قصیدے شعراء جاہلیت کے سُنا دئے، ولید ابن عبد الملک اور ہشام ہی کے دربار کا شخص تھا اور اگر انصاف سے کام لیا جائے، تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھیں خلفاء کی کوشش تھی جس نے قدیم شعراء کے کلام کو محفوظ رکھا ورنہ آج ایک لفظ بھی عہد قدیم کے لٹریچر کا نظر نہ آتا۔

ہر چند ہشام کے ساتھ عہد بنی امیہ کے عروج کا بھی خاتمہ ہو گیا، تاہم اس وقت تک جو کچھ ہو چکا تھا وہ بھی کم نہ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ بنیاد تھی جس پر بعد کو بنو عباس نے اپنی عمارت قایم کی اور اگر اسی کے ساتھ اسپین کی اموی خلافت قرطبہ پر لحاظ کیا جائے، جس نے قرونِ وسطیٰ میں اپنے علم و تہذیب کے کارناموں سے دُنیا کو متحیر کر دیا، تو شاید خاندانِ بنی امیہ کے احساناتِ علمیہ کا کوئی استقصا ہو ہی نہیں سکتا۔

عہد بنی عباس

جب بنو عباس کا عہد شروع ہوا، تو انہوں نے عہد بنی امیہ کے علمی باقیات الصالحات کو نہ صرف محفوظ رکھا، بلکہ اِس میں ترقی پیدا کرنے کی کوشش تام کی۔ چونکہ حکومتِ بنی عباس کے اصول بنو امیہ سے الگ تھے اور اُن کے امیال و عواطف زیادہ تر عجمی عنصر سے متعلق تھے اسلئے انکی کوششیں بھی جدا تھیں اور علمی مساعی کے حدود بھی بنو امیہ سے ذرا مختلف تھے۔

اس زمانہ میں نہ صرف تاریخ پر توجہ کی گئی، بلکہ علم الفقہ، فلسفہ اور دیگر علوم عقلیہ کی طرف بھی کافی اعتنا کیا گیا اور چونکہ اِس عہد میں یونانی تہذیب کے ساتھ عجمی مذاق بھی مل گیا تھا، اِس لئے انہوں نے شائستگی کی طرف نہایت سریع قدم اُٹھایا۔ لیکن اسی کے ساتھ انحطاط و زوال کے وہ جراثیم بھی پیدا ہو گئے جو دُنیادی جاہ و جلال، مادی دولت و ثروت اور انسانی تہذیب و شائستگی کے اجزاء لازم ہیں اور جنہوں نے آخر کار دولتِ عباسیہ کا شیرازہ منتشر کر دینے میں کوئی دقیقہ کوشش کا فروگذاشت نہیں کیا۔

عرب میں، یونانی علوم و فنون کا رواج تین ذرائع سے ہوا۔ اسکندر اعظم کے وقت سے

دجلہ و فرات کے درمیان کا حصہ تمام تر یونانی تہذیب سے متاثر تھا۔ چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب شاہِ آبارٹا کے دربار میں کراسس کی موت کی خبر پہونچی، تو اسوقت وہاں یوریپڈس (یونان کا نہایت مشہور شاعر و ڈرامانگار) کا ایک ڈراما جو ٹریجڈی سے متعلق تھا، دیکھا جارہا تھا۔ اِسکے بعد ۵۰۰ء میں ساسانی بادشاہ، خسرو انوشیرواں نے خوزستان میں جندشاپور کے مقام پر ایک اکیڈیمی (مجلسِ علمیہ) قایم کی، جو ساسانی حکومت کے زوال کے بعد بھی تین صدی تک قایم رہی۔ یہاں یونانی طب و فلسفہ کی بھی تعلیم دیجاتی تھی۔

اسکے بعد شامیوں نے دوآبہ دجلہ و فرات میں عربوں کے اندر یونانی فلسفہ کا مذاق پیدا کیا اور یہ مذاق اُن میں اس حد تک رچ گیا کہ مذہب عیسویت کے متعلق جو خیالات انہوں نے قایم کیے وہ بھی اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور اسطرح حکومتِ بازنطاین نے جو فائدہ اس سے اُٹھایا وہ تاریخ کا کھلا ہوا واقعہ ہے۔

چونکہ حکومتِ بازنطاین کے زیراثر، یونانی اور رومن حکمار سے اہلِ عرب کو تبادلۂ خیالات کا بہت موقع ملتا تھا، اسلئے وہ اقلیدس، افلاطون اور ارسطاطالیس کی کتابیں عام طور سے پڑھتے تھے اور اُن سے فائدہ اوٹھاتے تھے۔ علاوہ اسکے انطاکیہ اور موصل کے درمیان شامی عیسائیوں کی جماعتیں خانقاہوں کے اندر یونانی کتابیں عربی میں منتقل کر رہی تھیں، اور اسطرح علومِ یونانی کے ساتھ ساتھ، مسیحی خیالات بھی آہستہ آہستہ عربوں میں پھیلتے جاتے تھے۔

حرّان کے رہنے والے (شام کی یہی جماعت ایسی تھی جو اپنے اصلی مذہب پر قایم رہی) بھی خاص ذریعہ ہیں جنسے عربوں نے یونانی تہذیب کو حاصل کیا، چونکہ اہلِ حرّان، عربی زبان نہایت اچھی جانتے تھے اسلئے جو تراجم اُن کے ذریعہ سے ہوئے وہ نہایت مکمل تھے۔

خاندانِ عباسیہ کے عروج کا بنیادی پتھر منصور نے رکھا اور حقیقت یہ ہے کہ اسُ کے عہد میں زبانِ عربی کو بہت ترقی حاصل ہوئی، سیبویہ، کسائی، خلیل اسی عہد کے درخشندہ گوہر تھے اور اسی نے کسائی کو اپنے بیٹے مہدی کے تعلیم کے لئے بہ حیثیت اتالیق مقرر کیا تھا۔ اصمعی بھی اسی زمانہ میں ہوا ہے، جو اپنی قوتِ حافظہ کے لحاظ سے تاریخ عرب کی ایک نہایت ہی مشہور ہستی ہے۔

ذہبی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴۳ھ میں علمار اسلام نے فقہ، حدیث اور تفسیر کی کتابیں مُدوّن کرنا شروع کیں۔ چنانچہ ابن جریج مکہ میں اور امام مالک (صاحب موطا) مدینہ میں اوزاعی شام میں، ابن ابی عروبہ، حماد، ابو سلمہ، بصرہ میں، معمر یمن میں اور سفیان الثوری کوفہ میں مصروفِ تصنیف و تالیف تھے۔

جب ۱۴۸ھ میں خلیفہ منصور، بیمار ہوا اور اُس کے دربار کے اطبار نے جواب دیدیا، تو اُس نے جارج کو جو جندشاپور کی مجلس علمیہ کا مہتمم تھا، طلب کیا اور اِس کے علاج سے فائدہ ہوا۔ چنانچہ اسکے بعد سے دربار خلیفہ میں متعلقین اکیڈیمی کا اثر قایم ہوگیا اور بعد کو جارج کا پوتا (جبرئیل) ہارون الرشید کے دربار کا طبیب خاص مقرر کیا گیا۔

منصور کے عہد میں ایک اور شخص ابن مقفی بھی تھا، جو عربی اور فارسی کا بڑا زبردست ماہر تھا۔ اسنے کلیلہ دمنہ کا ترجمہ عربی زبان میں کرکے سب سے پہلے عربوں میں رومان کا مذاق پیدا کیا، جسکی ارتقائی صورت الف لیلی نظر آتی ہے۔ ابن مقفی نے شاہنامہ کا ترجمہ بھی عربی میں کیا اور یہی وہ تصنیف تھی جو بعد کو شاہنامہ فردوسی کی بنیاد قرار پائی۔

معقولات کو، جن کی ابتدا حسن بصری سے ہوئی تھی، ابتدار عہد عباسیہ میں زیادہ ترقی حاصل ہوئی اور خلیفہ منصور نے غیر مذاہب کی کتابوں کا بھی ترجمہ عربی میں کرایا، چنانچہ تعلیمات مانی کی کتابیں بھی اسی عہد میں ترجمہ کی گئیں۔ اِسکے علاوہ سنسکرت کی کتابوں پر بھی توجہ کیگئی، جنمیں سے ایک سدھنتا خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اسمیں شک نہیں کہ اسوقت، معقولات کا رواج زیادہ ہوتا جاتا تھا، لیکن اسکے ساتھ منقولات کو بھی پس پشت نہیں ڈالا جاسکتا تھا اور انکا اثر اسقدر قایم تھا کہ مامون بھی خلقِ قرآن کے مسئلہ کو عام طور سے رائج نہ کرسکا۔

عہدِ عباسیہ کے ابتدائی دس سال کے اندر علم الفقہ شروع ہوکر مرتب ہوگیا، عہدِ منصور میں ابو حنیفہ عہدِ ہارون میں مالک و شافعی اور عہدِ مامون میں احمد ابن حنبل وہ ہستیاں تھیں جن سے آج بھی ہر مسلمان اچھی طرح واقف ہے۔ خلیفہ مہدی کا زمانہ چنداں قابل ذکر نہیں کیونکہ اس نے علوم عقلیہ کی سخت مخالفت کی، لیکن اِسکے بعد ہارون نے اسکی بہت کچھ

تلافی کردی۔

ہارون نے اک بیت الحکمت بھی صرف اس لئے قایم کیا تھا کہ وہاں نہ صرف پہلی کتابیں محفوظ رہیں بلکہ اور جدید تصانیف، مختلف علوم کی شائع کی جائیں۔ فضل ابن نوبخت کو فارسی کتابوں کا مہتمم بنایا گیا، اور وہ یونانی کتابیں جنہیں ہارون، ایشائے کوچک کی طرف سے لایا تھا، یوحنا ابن ماسویہ کے سپرد کی گئیں۔ ہارون الرشید اپنے علم پروری کے لحاظ سے عجیب وغریب خلیفہ گذرا ہے۔ اسی نے ایک بار سفیان ابن عینیہ کو ایک لاکھ درم اور اسحاق موصلی کو دو لاکھ درہم بطور علمی انعام کے دیدیئے، اور یہی وہ خلیفہ تھا، جس نے مروان ابن ابی حفصہ کو صرف ایک نظم کے صلہ میں پانچہزار دینار، ایک خلعت زرین، ایک گھوڑا اور دس یونانی کنیزیں ایک وقت میں بخش دیں۔

الغرض اسکا دربار علما و شعرار، حکما و فضلار کا مرکز تھا اور اُس کی قدردانیِ علم کی شہرت تمام اطراف عالم میں پھیل گئی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ معقولات و منقولات کی تطبیق کا سخت مخالف تھا۔

اس کے بعد جب مامون کا عہد آیا تو مذہبی آزادی زیادہ بڑھ گئی اور اس نے خلقِ قرآن کے مسئلہ کو خود پیش کر کے، علما رعصر کی تصدیق کرانی چاہی، جس میں وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔

مامون، لٹریچر، فلسفہ اور دیگر علوم وفنون کا بہت بڑا قدر شناس تھا اور اس کے عہد میں علوم اسلامی نے اسقدر ترقی کی کہ اس کی نظیر کسی اور بادشاہ کے عہد میں نہیں ملسکتی۔

چونکہ مامون کی ماں اور بیوی دونوں ایرانی النسل تھیں اور علاوہ اس کے اسکا ابتدائی زمانہ مرو میں بسر ہوا تھا، جہاں ایرانی تہذیب کے مناظر کثرت سے نظر آتے تھے، اسلئے اُسکے عہد میں ایرانیوں کو بہت درخور حاصل ہوگیا اور اس نے اپنے تمدن کو ساسانی بادشاہوں کے انداز پر قایم رکھنا چاہا، جو بظاہر بہت خوش نما بات تھی، لیکن وہی آخر زوالِ خلافت کا باعث قرار پائی۔

ہارون الرشید کے عہد میں جو بیت الحکمۃ قایم ہوا تھا، اُس کو مامون نے اور زیادہ ترقی دی اور اُس نے قیصرِ روم کے پاس سے یونانی کتابیں منگوا کر عربی میں اُن کا ترجمہ کرایا۔ حُنین اور یعقوب کندی مخصوص طور پر یونانی کتابوں کا ترجمہ کرنے پر مامور تھے ان کے علمی کارنامے اس قدر ہیں کہ اُن کے ظاہر کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔

مامون کو علم ہیئت ونجوم کی طرف بھی خاص رجحان تھا، چنانچہ اُس کے اشارے سے یحییٰ ابن ابی منصور المامونی نے جو الزیج الممتحن اور کتاب العمل کا مصنف ہے، بغداد و دمشق کے قریب رصدگاہیں قایم کیں۔ لیکن مامون کی بے وقت موت کی وجہ سے یہ کام انجام کو نہ پہونچ سکا۔ محمد ابن موسیٰ بن شاکر کا زمین کی پیمایش کیطرف متوجہ ہونا بھی مامون ہی کے حکم سے ہوا تھا۔

مامون کے بعد المعتصم کا عہد شروع ہوا، جو ایک سپاہی مزاج خلیفہ تھا، اس لئے علوم وفنون کا وہ سیلاب جو مامون کے عہد میں رونما ہوا تھا، اس کے عہد میں رک گیا اور تقریباً دس سال تک اسی حالت میں رہا۔

جب ۲۲۷ھ میں واثق سریرآرائے خلافت ہوا تو پھر وہی علمی بیداری ہر جگہ نظر آنے لگی، جو عہدِ مامون میں پائی جاتی تھی۔ اس کے عہد میں بھی کثرت سے غیر زبانوں کی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں اور مذہبی آزادی بہت بڑھ گئی۔ یوحنا ابن ماسویہ اس کا دست راست ہوگیا اور بے شمار انعامات اس نے حاصل کئے۔ مسعودی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ واثق نے اس کو تین لاکھ درہم اٹھا کر دے دئیے۔

اس کا جانشین، المتوکل ہر چند ایسا علم دوست نہیں تھا، تاہم ترجمہ وتالیف کا کام اس کے زمانہ میں بھی جاری رہا۔ متوکل کے بعد خاندانِ عباسیہ کا زوال شروع ہوگیا لیکن اب بھی کچھ نہ کچھ سلسلہ علوم وفنون کا جاری رہا یہاں تک کہ شروع سے لیکر زوال خلافتِ عباسیہ تک بغداد کی سرزمین میں جو کچھ ہوگیا وہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اگر اس کی تفصیل بیان کی جائے تو ایک مستقل تصنیف مرتب ہو سکتی ہے۔

اسی سلسلہ میں ہم یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ خلافت بنی عباس کی تاریخ پانچ دَور میں تقسیم ہوتی ہے۔ اس کا بہترین زمانہ جسے عہدِ زرین کہنا چاہیئے، مامون پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا دَور وہ تھا جب جماعتِ اتراک کو در خور حاصل ہوگیا۔ یہ زمانہ ۳۳۴ھ تک قایم رہا۔ تیسرا دَور بویہی خاندان کے اثر واقتدار کا تھا، چوتھا سلاجقہ کی قوت کا اور پانچواں وہ جب انحطاط کی آخری منازل شروع ہوئیں اور آخر کار مغلوں نے آکر بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

ہر چند ۳۲۰ھ کے بعد سے ۶۵۶ھ تک کا زمانہ انتشار وانشقاق کا ہی تھا اور بہت سی چھوٹی

چھوٹی اسلامی حکومتیں قایم ہوکر، وہ مرکزی اقتدار جاتا رہا تھا جو مامون کے عہد تک پایا جاتا تھا، تاہم علم دوستی کا وہ مذاق جو اس سے قبل پیدا ہوچکا تھا، مفقود نہیں ہوا اور جہاں جہاں اسلامی حکومتیں قایم ہوئیں وہیں علوم وفنون کی قدر کیگئی۔

اس لئے اگر آپ خلافت عباسیہ کے سارے عہد کو پیش نظر رکھ کر (جس میں تمام چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں بھی شامل ہیں) صرف یہ معلوم کرنا چاہیں کہ اس تمام زمانہ میں کتنے علما گذرے ہیں تو ان کی صحیح تعداد بھی نہیں معلوم ہوسکتی۔ لیکن اگر صرف مشاہیر واکابر ہی کو لیا جائے تو انکی فہرست مرتب کرنے کیلئے بھی اک دفتر درکار ہے۔

فارابی، ابوبکر الرازی، ابوبشر، بوعلی سینا، ابن رشد، غزالی، فخرالدین رازی وغیرہ بہت سی ایسی مشہور ہستیاں ہیں جو اس عہد میں رونما ہوئیں اور اپنے نقوش، صفحات تاریخ پر ہمیشہ کے لئے ثبت کرگئیں۔

فارابی، ترکستان میں پیدا ہوئے اور مختلف زبانیں انھوں نے حاصل کیں، جس وقت یہ بغداد گئے تو ابوبشر کے خطبات فلسفہ میں شریک ہوئے اور اس کے بعد حران جاکر، ابو یوحنا ابن خیلان سے فلسفہ مسیحیت سیکھا، جب وہ بغداد واپس آئے تو یہاں خود فلسفہ کی تعلیم لوگوں کو دینے لگے۔ ان کو تفلسف کی طرف اس قدر رجحان تھا کہ انھوں نے ارسطاطالیس کی بعض بعض کتابیں چالیس چالیس مرتبہ پڑھیں اور پھر بھی اپنی عمر کی طرف سے بیوفائی کی شکایت لے گئے۔ ان کی بہت سی تصانیف، جو ان کی شہرت کا باعث ہوئیں، بغداد ہی میں لکھی گئی تھیں۔ اس کے بعد یہ دمشق چلے گئے اور وہاں سے مصر۔ مصر سے واپس آنے کے بعد وہ سیدھے شام آئے اور اس جماعت علماء میں داخل ہوگئے، جو سیف الدولہ حاکم حلب کے دربار میں پائی جاتی تھی۔ سیف الدولہ بڑا علم دوست شخص تھا، اس نے ان کی بہت قدر کی اور جب دمشق گیا تو انہیں بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

ابوبشر، منطق میں فارابی کا اُستاد تھا۔ یہ عیسائی تھا اور بغداد اسکا مسقط الراس تھا، منطق میں اسکو بڑا تبحر حاصل تھا اور اسی علم کی خدمت کرتے کرتے اسنے اپنی عمر تمام کردی۔ طبقات الحکماء میں اسکے تصانیف کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔

ابوبکر الرازی، خلیفہ مقتدر کے دربار کا طبیب خاص تھا۔ اِسنے چیچک پر اک عجیب و غریب رسالہ لکھا جو، اب ولایت میں معہ ترجمہ و حواشی کے شائع بھی ہوچکا ہے۔

سامانی فرمانروا، منصور ابن نوح نے بھی اسکی سرپرستی کی تھی جسکے لئے اسنے ایک رسالہ، طب پر المنصوری کے نام سے تحریر کیا تھا۔

حکمت عملی کے سلسلہ میں حسن ابن حسین، ابوالوفار اور ابن یونس خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں اور حکمتِ نظری کے لحاظ سے غزالی اور فخرالدین رازی اپنے عہد کے بے نظیر علمار میں سے تھے۔ غزالی نے نظام الملک طوسی کی سرپرستی میں ترقی کی اور اسقدر شہرت حاصل کرلی کہ خود اُن کے اُستاد بوعلی سینا کو بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔

ہر چند خلفار عباسیہ کا سیاسی اقتدار، امتدادِ زمانہ کے ساتھ کم ہوتا جاتا تھا اور اس کے ساتھ علمی ذوق و شوق میں انحطاط ہو رہا تھا، یہاں تک کہ الراضی باللہ، آخری خلیفہ تھا جس نے ممبر پر کھڑے ہوکر قابلِ ذکر خطبہ دیا اور اپنے دربار و نظام حکومت کے لحاظ سے فی الجملہ خلیفہ کہا جاسکتا تھا) تاہم یہ عجیب و غریب بات ہے کہ خلافت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے کے بعد بھی مختلف خود مختار اسلامی حکومتوں نے علم و حکمت کی قدردانی کو ترک نہیں کیا۔

اسدالدولہ نے علوم و فنون کی ترقی میں جس قدر حصہ لیا وہ اس سے ظاہر ہے کہ عبدالرحمٰن مشہور ماہر علم ہیئت اسکے دربار کا جوہر تابندہ تھا۔ اسی طرح المنصور سامانی، سیف الدولہ حمادی نے فارابی کی سرپرستی کرکے اپنی فضل شناسی کا جو ثبوت پیش کیا وہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ نظام الملک طوسی (الپ ارسلان اور ملک شاہ کے وزیر) سے کون واقف نہیں ہے کہ اُس نے کیسے کیسے اہل کمال کو یک جا کردیا تھا اور سب جانتے ہیں کہ صلاح الدین کی صحبت میں ہمیشہ بہاؤالدین، قاضی الفضل اور امام الدین کاتب ایسے نفوس رہا کرتے تھے۔

کوئی اسلامی حکومت ایسی نہ تھی جہاں کتب خانے اور دارالعلوم کثرت سے قائم نہ ہوئے ہوں اور ہر حکومت دوسری حکومت سے اس مسئلہ میں بڑھ جانے کی کوشش نہ کرتی ہو۔

بصرہ، کوفہ، بغداد، دمشق، مصر اور ادھر سارے عجم میں گھر گھر علم کا چرچا تھا۔ مسجدیں اور خانقاہیں اہل کمال کے فاضلانہ خطبات سے گونجا کرتی تھیں اور ممالک اسلامی کے ایک ذرہ ذرہ

سے علم وفضل کا دریا اُبل رہا تھا۔

کیا بصرہ کی تاریخ، واصل بن عطار اور جماعت اخوان الصفار کو کبھی فراموش کر سکتی ہے؟ کیا وہاں کی مسجدیں اِس لذت کو کبھی فراموش کر سکتی ہیں کہ علم و ادب، فلسفہ و ریاضی، ہیئت و نجوم کے کیسے کیسے اہم مسایل انہیں کی چار دیواریوں کے اندر حل ہوتے تھے؟ کیا قدیم قاہرہ، جامع الازہر پر بجا طور سے فخر نہیں کر سکتا جہاں سے ہزاروں ہستیاں فضل و کمال کا بہترین طرۂ امتیاز حاصل کر کے باہر نکلیں؟

کیا مسجدِ دمشق اُن واقعات کو بھول سکتی ہے کہ ابن ہشام المخزومی، روزانہ وہاں علمی مباحث جاری رکھتے تھے؟ کیا کوفہ کی مسجدِ سُلمی کے اُن دُروسِ قرآنی کو بھول جائے گی، جن سے روزانہ اس کے در و دیوار گونجا کرتے تھے؟ اور کیا کوئی شخص، دار العلوم نظامیہ اور مستنصریہ کو کبھی فراموش کر سکتا ہے؟ یہ حال تھا خاص خاص درسگاہوں کا ورنہ یوں تو ممالکِ اسلامی میں اسقدر کثرت سے مدارس طیار ہوئے کہ آج کوئی اُن کا شمار بھی نہیں کر سکتا پھر اِس کے ساتھ جب آپ اس حقیقت پر غور کریں گے کہ شوقِ علمی، صرف مردوں ہی میں نہ تھا بلکہ عورتیں بھی اس میں حصہ دار تھیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ علمی لہریں ممالک اسلامی کے مخفی ترین حصوں میں دوڑ گئی تھیں اور کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو اِن سے فیضیاب نہ ہو۔

از زاویہ کا دار الحکمت، نور الدولہ کی بیٹی ہی نے قایم کیا تھا اور دمشق میں بھی دو اکیڈمی ایک خاتون ہی نے قایم کی تھیں جسکا نام ست الشم تھا۔

حکومتِ مصر مصر میں، فاطمئین اور فرمانروایانِ ملوک نے بھی خاندان عباسیہ سے کم علم کی قدر دانی نہیں کی۔ علامہ سیوطی نے حسن المحاضرۃ میں تفصیل کے ساتھ اِس عہد کے علمی کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ المعز اور اس کے بعد تین فرمانرواؤں نے ترقی علم و تہذیب کے لئے اپنی پوری کوششیں صرف کیں اور بعض اوقات تو خلفار فاطمئین کے مساعی اِس باب میں خلفار عباسیہ سے بھی سبقت لے گئے۔ چنانچہ الحاکم بامر اللہ کا قایم کردہ دار الحکمۃ، تمام اسلامی ممالک کے مدارس سے زیادہ وسیع تھا۔

حکومتِ اسپین اسپین کی حکومتِ اسلام پر جب آپ مورخانہ نگاہ ڈالیں گے، تو یہاں بھی آپ

کو عجیب وغریب علمی مناظر نظر آئیں گے اور آپ کو حیرت ہوگی کہ کیونکر ایسے دور و دراز ملک میں پہونچکر مسلمانوں نے اِس قدر ترقی کرلی اور کس طرح انھیں مسیحی دشمنوں کے درمیان رہ کر اِس قدر فرصت نصیب ہوئی کہ علوم وفنون کو بھی اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

اسپین کا مشہور مصنف، ابنِ سعید لکھتا ہے کہ "قواعد اور علم بیان اور معانی میں، اندلس والونکو اس قدر انہماک تھا، کہ انھوں نے خلیل اور سیبویہ کے عہد کو بھی شرما دیا" پھر اسی کے ساتھ دیگر فنون میں بھی انھوں نے کم ترقی نہیں کی۔

ابن زہر کی کتاب التیسیر (جو علم طب کی بے مثل کتاب ہے اور جسکا ترجمہ اب یورپ کی تمام زبانوں میں ہوچکا ہے) زُہراوی کی تصنیف فنِ تشریح پر، یحییٰ کی کتاب علم الادویہ پر، دولتِ ہسپانیہ کے عہدِ حکومت کے خاص کارنامے ہیں۔

حکم ثانی کے زمانہ کو دیکھئے تو معلوم ہوسکتا ہے، کہ اسوقت علم کا کیسا چرچا تھا۔ یہ کتابوں کا حد درجہ شائق تھا اور اسُ نے تمام ممالکِ مشرق میں آدمی بھیج بھیجکر اسقدر نادر نسخے فراہم کئے تھے، کہ اُن کی فہرست صرف چالیس جلدوں میں مرتب ہوئی تھی۔ ابن باجہ اور ابنِ رشد اسُی کے عہد میں رونما ہوئے جن کے علمی کارنامے بیان کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔

اسپین کے مسلم عہدِ حکومت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ عورتیں حد درجہ مہذب وشائستہ ہوگئی تھیں۔ ولادہ (المستکفی کی بیٹی) اپنے عہد کی بڑی زبردست شاعرہ تھی اور علم بیان ومعانی میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھی، اسی طرح عائشہ (شاہزادہ احمد کی بیٹی) اس قدر فاضل تھی کہ اسُ کے خطبات، قرطبہ کے دار العلوم میں پڑھے جاتے تھے اور لوگ اُن سے فصاحت و بلاغت کا درس لیا کرتے تھے۔ یہ حال طبقۂ اُمراء کی عورتوں کا تھا لیکن معمولی طبقہ بھی اِس سے محروم نہیں تھا۔ چنانچہ لبنی، قرطبہ کے ایک معمولی خاندان کی لڑکی تھی، لیکن ادب وفلسفہ میں مشکل سے کوئی مرد بھی اسُ کے سامنے بروئے کار آسکتا تھا اور خلیفہ حکم نے اِس کے انہیں اکتسابات بلند کو دیکھ کر اپنے پرائیوٹ سکرٹری کی جگہ دیدی تھی، جو اِس سے قبل و بعد کبھی کسی عورت کو نصیب نہیں ہوئی۔ اسی طرح ایک خاتون، مریم (یعقوب الانصاری کی لڑکی)

تھی جو ادب و شعر کی تعلیم لوگوں کو دیا کرتی تھی۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ ہسپانیہ میں، اسوقت ستر کتب خانے موجود تھے۔ اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کے مسلمان فرمانرواؤں کو علم کا بہت ذوق تھا، بلکہ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مذاقِ علم وہاں پبلک میں بھی عام ہو گیا تھا۔ یہ تھا اک عام تبصرہ مسلمانوں کے ذوقِ علمی کا جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اِن کے کارنامے کیا کیا تھے اور شاہانِ اسلام کی سرپرستی میں کیسے کیسے لوگ پیدا ہوئے اور علوم و فنون کا کیسا معتدبہ ذخیرہ فراہم ہو گیا۔

حاجی خلیفہ نے بارہ سو، صرف تاریخی کتابوں کا نام اپنی فہرست میں درج کیا ہے اور اس میں وہ کتابیں شامل نہیں ہیں جنکا پتہ اُسے نہیں مل سکا۔

مورخ ابن ہشام سے لیکر (جو خلیفہ منصور کے عہد میں پائے جاتے تھے) ابنِ خلدون کے زمانہ تک (جو تیمور کا ہم عصر تھا) جتنی تاریخی کتابیں مدّون ہوئی ہیں، اگر آج وہ سب دستیاب ہو جائیں تو کئی کتب خانے صرف تاریخ کی کتابوں سے بھر سکتے ہیں۔ تمام مورخین میں سے آج ہمیں صرف طبری، ابن اثیر، مسعودی، بلاذری، ابن قتیبہ، خلدون، ابن خلکان، وغیرہ کے چند نام معلوم ہیں۔ اور نہیں کہہ سکتے کہ اور کتنے تھے جن کے کارنامے آج دُنیا کے سامنے موجود نہیں۔

اسی طرح فنِ جغرافیہ میں ہمیں ابنِ خوردادبہ، قُدامہ، مقدسی، یاقوت، ابوالفدا، وغیرہ سے اور دیگر علوم میں بھی صرف مخصوص افراد سے آگاہی حاصل ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص صرف علومِ اسلامی کی مفصل تاریخ لکھنے بیٹھے، تو باوجود اِس کے کہ لاکھوں کتابیں مفقود ہو گئیں ہیں، ہزاروں مصنفین کے نام دماغوں سے محو ہو گئے ہیں، اپنی پوری عمر صرف کرنے کے بعد بھی وہ اس فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

مغرب میں اخبار کیونکر مرتب ہوتا ہے

از نیاز فتحپوری

مغرب کی ترقی کے جس قدر اسباب بھی ہوں، لیکن یہ ایک مُسلّم حقیقت ہے، کہ انہیں میں ایک بڑا سبب رسائل وجرائد کی اشاعت بھی ہے۔ قوم کے جذبات میں تحریک پیدا کرنا، حاکم ومحکوم کے تعلقات کو نقطۂ اعتدال پر لانا، حالات عالم اور رفتارِ زمانہ کی ہر ارتقائی منزل سے پبلک کو آگاہ کرنا، زندگی کے تمام شعبوں پر تنقید کرکے نظام تمدن کو قایم رکھنا اور اسی طرح کی وہ تمام خدمات جنکا تعلق ایک مُلک کی حیاتِ ملی وہئیتِ اجتماعیہ سے ہے، اخبار ہی انجام دیتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ مغرب میں اِن کی قوت ایک بڑی زبردست قوت تسلیم کیجاتی ہے۔

ہمارے ہندوستان میں بھی جرائد ورسائل کی طرف سے اب وہ نفرت اور بیزاری نہیں رہی، جو اِس سے قبل پائی جاتی تھی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ صحیح معنے میں نہ یہاں کوئی اخبار شائع ہوتا ہے اور نہ غریب پبلک اِس سے باخبر ہے کہ ایک اخبار سے کِن توقعات کو وابستہ کرنا چاہیئے۔

آج ہم امریکہ کے ایک روزانہ اخبار کے نظام کو پیش کر کے بتانا چاہتے ہیں کہ وہاں ترتیب اخبار کے لئے کیا اہتمام کیا جاتا ہے، وہ پبلک کی کس قدر خدمت انجام دیتے ہیں اور خبریں فراہم کرنے کے وقت سے لیکر اشاعت تک کسقدر تگ ودَو اور کتنی عرقریزی سے کام لیا جاتا ہے۔

وہاں ہر اخبار کا نظام، تقسیمِ عمل کے اصول پر مختلف حصوں میں منقسم ہے:۔ ترتیب، اشاعت

اشتہار، طباعت اور عام کاروبار۔ ان میں سے ہر شعبہ ایک منتظم کے سپرد ہوتا ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام فرائض ٹھیک وقت پر انجام دے۔ ان تمام شعبوں کے منتظم باہم ملکر کام کی سہولت پر غور کیا کرتے ہیں اور حسب ضرورت منتظمِ عمومی (جنرل منیجر) سے بھی مشورہ و ہدایات حاصل کرتے رہتے ہیں۔

اخبار کی ترتیب سے لیکر اسکی اشاعت کے وقت تک، وہ خیال، جو بالاشتراک تمام کام کرنے والوں کے پیش نظر رہتا ہے، صرف سرعت ہے اور یہی وہ راز ہے کہ خبروں کی فراہمی، اخبار کی ترتیب، تصاویر وغیرہ کا انتظام، لاکھوں کی تعداد میں اشاعت اور وقت پر ہر شخص کے پاس اخبار کا پہونچ جانا، صرف چھ گھنٹے کے اندر انجام کو پہونچ جاتا ہے۔

اخبار کے مختلف شعبے

شعبۂ تحریر و ترتیب کا ایک "منتظم اعلیٰ" ہوتا ہے جو سر محرر (چیف اڈیٹر)، مدیر (پبلیشر) نامہ نگاروں کی جماعت، اور نائب محرر (سب اڈیٹر) کے کاموں کا جواب دہ ہوتا ہے۔

عام طور سے ہر شعبہ کے متعدد اسٹاف (جمعیتِ ارکان) ہوتے ہیں۔ جس جمعیت کا کام یہ ہوتا ہے کہ شام کا اڈیشن (طباعت) شائع کرے، وہ سات بجے صبح سے قبل آجاتی ہے اور شام کا اڈیشن شائع کرنے کے بعد فارغ ہوجاتی ہے۔ اسی اثنا میں، دوپہر کو دوسری جمعیت آجاتی ہے، جسے صبح کا اڈیشن شائع کرنا ہوتا ہے اور پھر آدھی رات کو تیسری جمعیت آجاتی ہے، جو صبح کو فارغ ہوتی ہے۔ اور اس طرح شب و روز کے ہر لمحہ میں کام ہوتا رہتا ہے۔

کام کی تقسیم اس طرح کی جاتی ہے کہ تمام دُنیا کی خبریں، آسانی کے ساتھ فراہم ہوکر اخبار میں درج ہوجائیں۔ اس غرض کو پورا کرنے کیلئے، خبروں کی نوعیت کے لحاظ سے ایک ایک شخص علیحدہ کردیا جاتا ہے۔ مثلاً جس شخص کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ سیاسی خبروں کو وصول کرکے ترتیب دے، اُسے ڈراما و موسیقی کی خبروں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، جسکا کام تجارتی خبروں کو مرتب کرنا ہے، وہ دوسری خبروں کی ترتیب کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ افتتاحیہ (لیڈنگ آرٹکل) اور شذرات (نوٹس) کے لکھنے والے علیحدہ ہوتے ہیں۔

خبروں کے جمع کرنیکا طریقہ

دن بھر کی خبریں فراہم کرنے کے دو طریقے ہیں:- (۱) وہ مقامات جو شہر سے الگ ہیں، وہاں کے حالات، تاروں، نامہ نگاروں کی تحریروں اور خاص خاص خبر رسانی کے محکموں

کے ذریعہ سے معلوم کئے جاتے ہیں، جنکا تعلق، محررِ تلغرافی (ٹیلیگراف اڈیٹر) سے ہوتا ہے۔ (۲) شہر کی خبریں مقامی مخبرین (لوکل رپورٹر) کے ذریعہ سے فراہم کیجاتی ہیں، جو تمام گلی کوچوں میں اسی غرض کیلئے پھرتے رہتے ہیں اور اخبار کیطرف سے انہیں کافی معاوضہ دیا جاتا ہے۔ یہ خبریں محررِ بلدہ (سٹی اڈیٹر) کے پاس جاتی ہیں۔

محررِ تلغرافی کے مُعاون، متعدد ہوتے ہیں، جنہیں نقل خواں (کاپی ریڈر) کہتے ہیں۔ انکا فرض ہے کہ وہ اُن تمام خبروں کو جو ذریعۂ تار موصول ہوتی ہیں بغور پڑھیں اور اگر کسی میں کوئی غلطی رہ گئی ہے، تو اُسے درست کریں۔ خبروں کے نمایاں عنوانات قایم کرنا اور اُن واقعات کو مسترد کردینا جنکا تعلق اخبار کی پالیسی سے نہیں ہے، انھیں سے متعلق ہے۔

ایسوشی ایٹڈ پریس | اب ہندوستان میں بھی ایسوشی ایٹڈ پریس، کوئی نئی چیز نہیں، لیکن غالباً یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مغرب میں اسکا نظام کیا ہے؟

امریکہ میں یہ پریس ... مختلف اخباروں کی باہمی شرکت کا نتیجہ ہے، اسکا مقصد یہ ہے کہ تمام دُنیا کی خبریں فراہم ہوکر اُن لوگوں کے پاس پہونچتی رہیں، جو اس سوسائٹی (جمعیت) کے ممبر ہیں۔ اس غرض سے دُنیا کے تمام بڑے شہروں میں، اسکے کارکُن (ایجنٹ) پھیلے ہوئے ہیں، جو وہاں کی خبر اُنکو ذریعہ تار روانہ کیا کرتے ہیں۔ امریکہ کے بڑے بڑے مقامات میں، جہاں متعدد اخباروں کو یہ اطلاعات پہونچانی پڑتی ہیں، اس پریس کا ایک مرکزی دفتر بھی ہوتا ہے، جہاں یہ خبریں ٹائپ کرنے کے بعد ہوائی نالیوں کے ذریعہ سے (جسکا حال آپ اسی اشاعت میں کسی دوسری جگہ ملاحظہ فرمائیں گے) وقتِ واحد میں تمام متعلق اخباروں کے دفاتر میں پہونچادی جاتی ہیں۔

مقامی خبریں | شہر کی خبریں فراہم کرنے کی ذمہ داری محررِ بلدہ اور اسکی ماتحت جماعت پر عاید کیجاتی ہے۔ اس غرض کیلئے جو مخبر مامور ہوتے ہیں، وہ بھی مختلف جماعتوں میں منقسم ہوتے ہیں، اور ہر جماعت کے متعلق خاص قسم کی خبریں فراہم کرنیکا انتظام کیا جاتا ہے۔ مثلاً پولس، عدالت، تجارت، ریل وغیرہ کی اطلاعات حاصل کرنا، الگ الگ جماعت کے سپرد ہے۔

یہ خبر رساں جماعتیں چاروںطرف منتشر رہتی ہیں اور ہر گلی کوچہ میں واقعات حاصل کرنیکے لئے تمام وقت گوش برآواز رہتی ہیں۔ ولایت میں ایک اخبار کی شہرت و معقولیت کا انحصار ہی اس امر پر ہے کہ کوئی

قابل ذکر واقعہ اندراج سے نہ رہ جائے۔ اگر کوئی اخبار اپنی کاوش وجستجو سے کوئی ایسا واقعہ درج کر دیتا ہے، جو دوسرے اخباروں کی اطلاع سے باہر ہے تو اسکی اشاعت پر نہایت اچھا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں خبریں نہایت اہتمام اور مخفی طریقہ سے فراہم کیجاتی ہیں اور جلد سے جلد انہیں شائع کر دیا جاتا ہے۔

مثلاً کسی رپورٹر نے نصف شب کو کسی ہوٹل (نزل) کے اندر دو آدمیوں کو یہ گفتگو کرتے ہوئے سُنا کہ فلاں فوجی افسر نے فلاں ہوٹل میں، عین شادی کے دن خودکشی کر لی۔ چونکہ یہ خبر وہاں کیلئے نہایت دلچسپ ہے، اسلئے رپورٹر تمام ممکن تفصیل اس واقعہ کی حاصل کر کے اسی وقت اخبار کو اطلاع دیگا اور جسوقت صبح کے اڈیشن میں یہ خبر شائع ہوگی تو دیگر اخبارات جنہیں یہ اطلاع حاصل نہیں ہوئی ہے، اسکو نگاہ رشک سے دیکھیں گے، کیونکہ صرف ایک ایسی خبر کی وجہ سے اس اخبار کی ہزاروں، لاکھوں کاپیاں زاید فروخت ہو جائینگی

جسوقت سے کہ کسی واقعہ کی اطلاع ہوتی ہے، اسوقت تک کہ وہ اخبار میں شائع نہ ہو جائے، نظام اخباری کا ہر شخص متحرک تصاویر کی طرح نہایت سُرعت کے ساتھ اپنی جگہ مصروف و منہمک نظر آتا ہے۔ مثلاً شہر کی کسی عمارت میں آگ لگی اور اخبار کے دفتر میں گھنٹی بجی (جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شہر کے فلاں حصہ میں آتشزدگی واقع ہوئی ہے) تو سٹی اڈیٹر اسی لمحہ میں نقاشوں، مصوروں، رپورٹروں، کو موٹر کے ذریعہ سے وہاں روانہ کریگا تاکہ اس واقعہ کے تمام تفصیلی حالات اُسے معلوم ہو جائیں۔ ادہر دفتر میں ایک شخص ٹیلیفون پر بیٹھ جائیگا، جو ان اطلاعات کو نوٹ کرتا جائیگا۔ جسوقت یہ لوگ مقام آتشزدگی پر پہونچ جاتے ہیں، اسیوقت سے ایک ایک منٹ کے بعد ٹیلیفون کے ذریعہ سے دفتر اخبار کو اطلاع دیتے رہتے ہیں کہ اب آگ کی کیا حالت ہے، کسقدر مال ضائع ہو چکا ہے، کتنی جانیں معرض خطر میں ہیں، آگ بجھانے والے کیسا کام کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ، اگر دیر زیادہ ہو گئی ہے اور اخبار کے شائع ہونیکا وقت قریب ہے تو پھر ٹیلیفون پر ایک مسلسل گفتگو کے ذریعہ سے تمام حالات بیان کر دیئے جاتے ہیں اور اسوقت تک جتنی تصاویر حاصل ہوئی ہیں، وہ فوراً بلاک بنانے جانیکے لئے متعلقہ شعبہ میں دیدیجاتی ہیں۔

سٹی اڈیٹر

جب کسی واقعہ کی اطلاع سٹی اڈیٹر کے پاس پہونچتی ہے، تو وہ یا اُسکا کوئی معاون خبر کی اہمیت پر غور کرتا ہے اور پھر اسی اہمیت کے لحاظ سے فیصلہ کرتا ہے کہ اخبار کے کس حصہ میں اور کس عنوان و صورت سے اُسے درج کرنا چاہیئے۔

کاپی ریڈر، پروف ریڈر

سٹی اڈیٹر کے پاس سے خبر کا کاغذ کاپی ریڈر کے پاس جاتا ہے۔ یہ اُن غلطیوں کو درست

کرتا ہے، جو عجلت کی وجہ سے اسمیں رہ گئی ہوں اور بڑے چھوٹے عنوانات قائم کر کے ٹائپ جمانیوالے کو دیدیتا ہے۔ یہاں سے پھر وہ پروف کی صورت میں چھپ کر، پروف ریڈر کے پاس جاتا ہے اور پھر اڈیٹروں اور کاپی ریڈروں کے پاس، تاکہ جو غلطیاں باقی رہ گئی ہیں، انھیں درست کر دیا جائے۔

لینو ٹائپ | یہ عصرِ حاضر کی وہ مشین ہے، جس کے ذریعہ سے تمام کثیر الاشاعت جرائد چھپتے ہیں۔ اسکی صورت ایک بڑے ٹایپ رائٹر کی طرح ہوتی ہے، جسکے سامنے ایک آدمی بیٹھا ہوا۔ اخبار کے مسودہ کو دیکھتا جاتا ہے اور ٹایپ کرتا جاتا ہے، لیکن جسطرح معمولی ٹایپ رائٹر میں ٹایپ کرنے سے ایک کاغذ چھپتا چلا جاتا ہے، اسمیں پوری سطر کا ٹایپ ڈھلکر طیار ہوتا رہتا ہے۔

لینو ٹایپ کے بعد وہ پریس میں چھپنے کیلئے جاتا ہے اور یہاں وہ جس طرح طبع ہوتا ہے، جس طرح لاکھوں کی تعداد میں مشینوں کے ذریعہ سے کٹتا ہے، ملفوف ہوتا ہے، بنڈلوں میں باندھا جاتا ہے، وہ ایک مستقل افسانہ ہے، جسکو نہ یوں کوئی سمجھ سکتا ہے اور نہ اسکی صحیح تصویر الفاظ کے ذریعہ سے پیش ہو سکتی ہے، مختصراً یوں سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک گھنٹہ کے اندر ۸ صفحہ کی ایک کاپی دو لاکھ کی تعداد میں چھپکر سارے شہر میں پھیل جاتی ہے۔

ڈلیوری رُوم | جسوقت اخبار طیار ہو کر، ڈلیوری رُوم میں آتا ہے، تو پھر یہاں کا ہنگامہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ ہزاروں لڑکے، اخباروں کے ایجنٹ، گاڑیاں، موٹریں، طیار رہتی ہیں تاکہ آفتاب نکلنے یا غروب ہونیسے قبل ہر ہر گلی کوچہ میں اخبار پھیل جائے اور جب لوگ بسترِ خواب سے اٹھیں تو سب سے پہلے جو چیز انھیں سامنے میز پر نظر آے، وہ اسُ صبح کا اخبار ہو۔

شہر سے باہر اخبارات، ریل کے ذریعہ سے روانہ کئے جاتے ہیں اور چونکہ ریل، اخبار کا انتظار نہیں کر سکتی، اسلئے کوشش کیجاتی ہے کہ عین وقت پر اخباروں کے بنڈل، اسٹیشن پر پہونچ جائیں۔

اس خیال سے کہ اخبار کی ترتیب میں اتنی دیر نہ ہو جائے کہ پھر چھپنے کے بعد وہ وقت پر اسٹیشن تک نہ پہونچ سکے ایک وقت متعین پر برقی گھنٹی زور زور سے بجنا شروع ہوتی ہے اور اس آواز کے ساتھ ہی ترتیب کا کام فوراً ختم کر دیا جاتا ہے اور طباعت شروع ہو جاتی ہے۔

تصاویر کا شعبہ | تمام بڑے بڑے اخباروں کے متعلق ایک شعبہ نقاشی اور تصویر کشی کا بھی ہوتا ہے، جسکا مختصر ذکر آتشزدگی کے سلسلہ میں ہو چکا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس شعبہ کا کام بہت اور نہایت اہم ہے، تمام صیغۂ اشتہارات جو اصل ذریعہ آمدنی کا ہے، اسی شعبہ کا محتاج ہوتا ہے۔ علاوہ اسکے متعدد نقاش و مصور

موٹروں میں بیٹھے ہوئے ہر وقت صرف اسلئے گھوما کرتے ہیں کہ وہ اخبار کیلئے دلچسپ تصاویر، واقعات کے نقوش، خاص خاص مواقع کے کارٹون (صُوَرِ ہزلیہ) فراہم کرتے رہیں۔ جب تصاویر تیار ہو جاتی ہیں تو بلاک بنانے کے شعبہ میں بھیجدی جاتی ہیں، جہاں سینکڑوں مشینیں ہر وقت یہی کام کرتی رہتی ہیں۔

اشتہارات اخبارات کی آمدنی صرف اسی شعبہ سے ہوتی ہے، کیونکہ ترتیبِ اخبار میں اسقدر صرف ہو جاتا ہے کہ اگر اشتہار کی آمدنی نہ ہو تو اخبار ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ یہ شعبہ نہایت وسیع ہے اور اسکا اہتمام شعبۂ ترتیب سے زیادہ وسیع پیمانہ پر ہوتا ہے۔

اب اس بیان کے بعد ہندوستان کے اخباروں کا عالم دیکھئے، جہاں ایک ہی شخص اڈیٹر بھی ہے اور منیجر بھی، پرنٹر بھی ہے اور پبلشر بھی، لیکن اسکا کیا علاج کہ یہاں کا اڈیٹر "لیس بمستنکر ان یجمع العالم فی شخص واحد" (یعنی یہ مستبعد نہیں ہے کہ ایک شخص کے اندر سارا عالم جمع ہو جائے) کا مصداق بنا ہوا، اس ذلت کے باوجود بھی اپنے تئیں اڈیٹر خیال کرتا ہے اور یہاں کا اخبار بھی باوجود اس بے مائگی و فروتنی کے اخبار کے نام سے مشہور ہے۔

خانقاہ کا قیدی

(از :- حضرت قمر)

غروبِ آفتاب کی آخری شعاعیں، بیت المقدس کی دیواروں پر پڑکر انھیں رنگین بنا رہی تھیں اور شہر کے چاروں طرف کی پہاڑیاں گہرے گلابی رنگ میں نہائی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ایک گہری وادی جہاں آفتاب کی شعاعیں نہ پہونچ سکتی تھیں اور جہاں ایک نیلگوں تاریکی پھیلی ہوئی تھی، مریم مقدس کی سپید خانقاہ ایسی نظر آتی تھی جیسے سطح بحر پر برف کی چٹان۔

یہاں کی ہوا سرد تھی اور خوشگوار، یہاں کی فضا غیر متحرک تھی اور سکون بخش۔ دنیا سے الگ، مشاغل حیاتِ انسانی سے جدا، خانقاہ کے چاروں طرف کی وادی میں ایک غیر منقطع سکوت طاری تھا، کہ دیوار کے سایہ سے ایک لڑکی نمودار ہوئی اور تنگ پتھریلی سڑک پر آکر جلدی جلدی قدم اُٹھانے لگی۔

معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے دل میں کسی خوف کو لئے ہوئے جارہی ہے اور اسکا ہر لمحہ اسکے لئے بہت قیمتی ہے، وہ گھڑی گھڑی پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی ہے کہ کوئی اُسکے تعاقب میں تو نہیں آرہا اور پھر مطمئن ہو کر نئے جوش مسرت کے ساتھ اُسکی رفتار میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔

آخر کار وہ زیتون کے جھنڈ کو طے کرکے اُس جگہ پہونچگئی جہاں سے سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی، جہاں سے ایک راستہ تو خانقاہ کے صدر دروازہ تک پہونچتا تھا اور دوسرا خشک پہاڑیوں کی طرف جسکو عبور کرنیکے بعد خدا کی وسیع زمین ہر طرف پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔

لڑکی نے یہی دوسرا راستہ اختیار کرلیا اور جب وہ زیتون کے دوسرے جھنڈ کو عبور کرکے اُسکے کنارے پر پہونچی تو وہ رک گئی اور اپنے چاروں طرف ایک نظر ڈالکر آہستہ سے بولی "کیا تم یہاں نہیں ہو؟"

نرم و نازک آواز فضا میں اچھی طرح پھیلنے بھی نہ پائی تھی کہ قریب کی جھاڑی سے ایک سرسراہٹ معلوم ہوئی اور ایک یونانی راہب اپنی وسیع اور طویل عبا پہنے ہوئے، خانقاہ کی دیوار سے اُتر کر اسکی طرف بڑھا، مسرت کا تبسم اُسکے چہرے پر دوڑ رہا تھا، کامیابی کا سرور اسکی آنکھوں سے ظاہر تھا۔ وہ بڑھا اور لڑکی کے دونوں نازک

ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بولا "تم آگئیں ؟ کیا تم نے فیصلہ کر لیا اور اب بالکل آمادہ ہو کر آئی ہو ؟"

لڑکی نے دیوار کا سہارا لیا اور اپنا چہرہ اٹھا کر (جس سے شفق کی روشنی کو یہ بتلا دینے کا موقع ملا کہ وہ غیر معمولی حسین ہے) جواب دیا "ہاں میں طیار ہوں، اگر تمہیں یقین ہے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ درست ہے اور آلو ہیم ہماری مدد کریگا"۔

راہب :- "ہاں مجھے یقین ہے۔ رات ہی کی بات ہے کہ جب میں صلیب مقدس کے سامنے دوزانو ہو کر اپنی صمیمی آرزوئیں پیش کر رہا تھا، اک آسمانی آواز میرے کانوں میں آئی کہ "اے راہب اٹھ اب تجھے ریاضت کی ضرورت باقی نہیں رہی، تو اس لڑکی کے ساتھ جس سے تو محبت کرتا ہے جا اور دُنیا کا لطف اُٹھا۔ مجھے وہ آرزوئیں، جو کامیاب اور مسرور دلوں سے پیدا ہوں، زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہیں، اس کراہ سے، جو کسی مصیبت زدہ ہستی سے پیدا ہو۔ میں نے نیلگوں آسمان اور سبز پہاڑیاں اسی لئے بنائی ہیں کہ تو انہیں دیکھے اور میری حمد کرے"۔

لڑکی، جو نہایت غور کے ساتھ اس بیان کو سُن رہی تھی، مسرور ہو گئی اور راہب، لڑکی کا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھکر اور خانقاہ کی عمارت کو دیکھکر بولا "یہی ہے وہ جگہ جس کے اندر کامل دس سال تک میں نے دنیا کے تمام مصائب کا مقابلہ کیا"۔

"شکر کرو کہ آلو ہیم نے ان مصائب کو دُور کر دیا" لڑکی یہ کہتی ہوئی جھکی اور زمین پر سے کپڑوں کا ایک بقچہ اُٹھا کر جسے وہ ساتھ لائی تھی بولی "میں یہ تمہارے لئے لائی ہوں۔ جلدی سے اپنا راہبانہ لباس اُتار کر یہ کپڑے پہن لو" اور یہ کہکر ذرا آگے بڑھ گئی۔

رات کی تاریکی زیادہ نمایاں ہو چلی تھی اور آسمان کے گہرے ارغوانی رنگ میں ستاروں کی جھلملاہٹ زیادہ روشن نظر آتی تھی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جنگل کی طرف سے بیت المقدس کے آبادی کی جانب چل رہی تھی۔ لڑکی اپنی پیٹھ کا زور دیوار پر دئے ہوئے اور دونوں ہاتھ سے زانو کو تھامے ہوئے بیٹھی تھی، اسوقت اُس کے چہرے سے وہی حُسن نمایاں تھا، جو ایک عزم کر لینے کے بعد خوبصورت نقشہ والوں کے خدوخال سے ظاہر ہونے لگتا ہے، اسکا گورا رنگ، کتابی چہرہ، سیاہ اور خمیدہ ابرو، بڑی بڑی آنکھیں اور پھر ان سب سے زیادہ اُسکا مسکر شباب۔ یہ ایسی معمولی چیزیں نہیں جن کی نمود صرف روشنی کی محتاج ہو۔ وہ تاریکی میں دیوار کے سہارے سے ایک مجسمہ کی طرح بیٹھی ہوئی تھی لیکن اپنے حُسن و شباب کے امتزاج سے چاروں طرف کی فضا کو

منور کئے ہوئے تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد راہب بھی آگیا۔ لیکن اب وہ راہب نہ تھا بلکہ ایک متمدن انسان تھا۔ نہ خانقاہ کا عبا اس کے جسم پر تھا اور نہ وہاں کی اونچی سیاہ ٹوپی سر پر۔ لانبے لانبے بال اُس نے دو حصوں میں تقسیم کر کے سر کے چاروں طرف لپیٹ لئے تھے اور اِس کی وضع بالکل اُس عہد کے یہودیوں کیطرح ہوگئی تھی۔ لڑکی نے فوراً اپنی کمر سے ایک پٹکا کھولکر راہب کے کمر میں باندھ دیا تاکہ وہ ہر لحاظ سے ایک یہودی نظر آئے۔ اور عبا اور ٹوپی اُٹھا کر دونوں جلدی جلدی روانہ ہوگئے۔ لڑکی کو پہاڑیوں سے عبور کرنے کا مختصر راستہ معلوم تھا اسلئے وہ رہبر بنگئی اور راہب اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر ساتھ ہوگیا۔

رات کی ہوا اُن کے چہروں سے مس ہو ہو کر گذر رہی تھی۔ پہاڑیوں کا سکوت درندوں کی آواز سے ملکر نہایت ہولناک ہوتا جاتا تھا، تاروں کی شعاعیں اُن کے راستہ پر نہایت کمزور ہو ہو کر پڑ رہی تھیں لیکن اِن کے لئے نہ کوئی خوف تھا نہ ہراس، نہ ماندگی تھی نہ اضطراب۔ محبت کا جوش اور حسن کی وفاشعاری ایک ایسی روشنی تھی، اک ایسی جائے پناہ تھی کہ اُس وقت انہیں ساری دُنیا منوّر نظر آرہی تھی اور عالم کا ذرّہ۔ ذرہ۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے ساتھ ہمدردی کر رہا ہے۔

راہب، جس نے اپنی زندگی کے دس سال خانقاہ مریم کے تاریک قیدخانہ میں بسر کر دیئے تھے، جس نے اپنے شباب کی خدا جانے کتنی چاندنی راتیں یونہی بے کسی کے عالم میں مجبور و مضطرب ہو کر گذار دی تھیں۔ آج خدا کی وسیع دُنیا دیکھ رہا تھا اور ایسا محسوس کر رہا تھا کہ اسکے پاؤں میں مرکرہی کی طرح پر و بال نکل آئے ہیں جو اُسے اُڑائے لئے جاتے ہیں۔

جس وقت وہ خانقاہ میں محبوس تھا، تو روز شام کو اپنے دریچہ سے، اِس یہودی کی لڑکی کو ادھر سے گذرتا ہوا دیکھا کرتا تھا۔ اور کوئی منظر غروب آفتاب کا ایسا نہ ہوتا تھا جو اِس لڑکی کے حسین چہرہ کو اور زیادہ رنگین بنا کر راہب کے شباب میں دیوانگی پیدا نہ کر دیتا ہو۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ کیا، حسن، ایسا حسن کسی گمراہ کر دینے والی قوت نے پیدا کیا ہے، جو انسانی روحوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ پھر کہتا کہ اگر حقیقت یہی ہے تو آسمان و زمین، آفتاب و ماہتاب، ہوا اور پانی، وادی اور جھیل، دریا اور پہاڑ یہ سب اسی قوت کے نتائج ہیں۔ کیونکہ مجھ سے دُور ہو کر تو میرے لئے یہ سب تباہ کن ہیں۔ اگر اِس عورت کو تمام مخلوقات عالم سے کوئی امتیاز حاصل ہے تو صرف یہ کہ ہم اُسے قدرت

کی اختراع فائقہ کہہ سکتے ہیں۔
ایک رات وہ اسی خیال میں مستغرق تھا کہ دوسرا راہب اُس کے پاس سے گذرا۔ اُس نے اُس سے پوچھا "کیا یہ ساری دُنیا شیطان کی پیدا کی ہوئی ہے"؟ اور یہ جواب سنکر کہ "نہیں یہ سب قدرتِ خداوندی کا کرشمہ ہے" وہ اک مسرت کے ساتھ اپنے حجرہ میں چلا گیا، اور دوسری شام کو اُس نے اِس لڑکی سے کچھ گفتگو کی جسمیں بہت کچھ اسکے شباب کی التجائیں شامل تھیں۔
ظاہر ہے کہ وہ جوانی جس نے اپنے نشو و نما کے ابتدائی زمانہ سے لیکر وقوف کے عہد تک کسی سے گفتگو نہ کی ہو، جب گفتگو کرنے پر آئے گی، اور مخاطب اس شکل و صورت، اس ہیئت و شباہت کا ہوگا، تو کیا کچھ نہ کہدے گی۔ راہب کی ایک ایک بات بجلی کی ایک لہر تھی جو یہودی لڑکی کے دل و دماغ میں سرایت کرتی جاتی تھی۔ اسکی ایک ایک نگاہ کیوپڈ کا زرین تیر تھا، جس سے لڑکی زخمی ہو ہو کر کچھ اور زیادہ مجروح ہونے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔
یہ گفتگو بڑھی یہ دور کی ملاقاتیں وسیع ہوئیں، جذبات نے ارادے پیدا کئے اور آخر کار ارادوں نے یہ عملی صورت اختیار کر لی کہ اس رات کو حسن و شباب دونوں یکجا ہو گئے۔
پانچ میل تک یہ دونوں پہاڑی راستے طے کر چکے ہونگے کہ لڑکی کھڑی ہو گئی اور بولی کہ "میں تھک گئی ہوں کچھ دیر آرام کرنا ضروری ہے"۔
راہب کو تعجب ہوا کیونکہ اُسے آزادی کی مسرت میں جو اُسکے لئے دُنیا میں بالکل نئی چیز تھی، اسوقت تک تھکن محسوس نہیں کی تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ شاید اضمحلال و خستگی کا تعلق انسانی رفتار سے بالکل نہیں ہے جبکہ وہ خانقاہ سے باہر ہو۔ وہ بھی رک گیا اور دونوں راستے سے علیحدہ ایک بڑی چٹان کے نیچے لے گیا جو قریب ہی پہاڑی کے دامن میں باہر کو نکلی ہوئی تھی۔
لڑکی وہاں پہونچتے ہی لیٹ گئی اور لیٹتے ہی سو گئی۔ لیکن راہب جو اپنی آغوش میں اک حسن بے خبر کی تمام نظری لذتیں حاصل کرنے کیلئے آزاد چھوڑ دیا گیا تھا، جاگتا رہا اور اسوقت تک اس انہماک بیدار سے لطف اُٹھاتا رہا، جبتک شعاع آفتاب کے ساتھ لڑکی نے بیدار ہو کر راہب کی محبت پاش نگاہوں سے شرما کر اپنے بدن کو چھپا نہیں لیا۔
چونکہ اب آفتاب نکل آیا تھا، جنگل کے تمام راستے روشن ہو چکے تھے، صحرائی درندوں کا خوف

باقی نہ رہ گیا تھا، اس لئے لڑکی گھبرا کر اٹھی اور اپنے منتشر بالوں کو جلدی جلدی سمیٹ کر سفر کے لئے طیار ہو گئی۔

سارا دن اسی طرح گذرا اور شام کو دونوں جبریکو پہونچے۔ اور گانوں کے سب سے آخر مکان میں جہاں سلیمان یہودی ان دونوں کا انتظار کر رہا تھا داخل ہو گئے۔

مکان کا بالائی حصہ ان کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا یہ وہاں پہونچے اور منہ ہاتھ دہونے کے بعد جب سفر کا تکان کچھ کم ہو گیا تو دستر خوان بچھایا گیا۔ اس وقت سلیمان کا چھوٹا بھائی بھی موجود تھا۔

سلیمان بیت المقدس کے حالات پوچھ رہا تھا اور عذرا بیان کر رہی تھی۔ دوران گفتگو میں سلیمان کے بھائی نے نہایت حسرت سے کہا کہ "میں بیت المقدس جانے کے لئے کس قدر بیتاب ہوں۔ لیکن نہ کوئی مرکب میرے پاس ہے اور نہ اس قدر طویل راستہ پیادہ پا طے کر سکتا ہوں۔"

آدھی رات گذر چکی تھی سارا جبریکو گہری نیند میں ملفوف تھا، تمام گانوں تیرہ و تار نظر آ رہا تھا اور چاروں طرف سکونِ مطلق طاری تھا کہ بیت المقدس کی طرف سے ایک گاڑی گانوں میں داخل ہوئی اور گھوڑوں کا رخ سلیمان کے مکان کی طرف کر دیا گیا۔

عذرا، جو راہب کے شانہ پر اپنا سر رکھے ہوئے ایک کامیاب نیند کی لذت میں مصروف تھی، آواز کو سن کر دفعتہً چونک پڑی اور راہب کو جگا کر بولی کہ "اٹھو تعاقب کرنیوالے آ گئے" راہب اٹھا اور آہستہ سے کھڑکی کھول کر اس نے باہر جھانکا۔ ہر چند تاریکی شدید تھی لیکن غور کرنے سے اس نے معلوم کر لیا کہ باہر دو آدمی کھڑے ہیں اور دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں۔

دوسری کھڑکی کھلی اور سلیمان یہودی نے پوچھا "کون اسوقت دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے؟"

"ہم ہیں خانقاہِ مریم کے راہب، ہمیں جس کی تلاش ہے وہ اس مکان کے اندر ہے، اسلئے ہمیں داخل ہونے دو"

راہب یہ سنکر کانپ اٹھا، اور عذرا سے بولا "کیا الوہیم ہمارے ساتھ نہیں ہے؟"

"الوہیم ساتھ ہو یا نہ ہو، لیکن عذرا تمہارے ساتھ ہے اور وہ جب تک زندہ ہے تم اس سے

جدا نہیں ہو سکتے"

یہ کہکر اس نے راہب کا وہ لباس، جو خانقاہ میں استعمال کیا جاتا ہے، اٹھالیا اور فوراً کمرہ سے باہر نکل گئی۔ اور سلیمان سے یہ کہتی ہوئی کہ "دروازہ کھولنے میں جسقدر دیر تم سے ممکن ہو کرو"، سیدھی اس کمرہ میں چلی گئی، جہاں سلیمان کا بھائی مصروفِ خواب تھا۔

"حیرون، اٹھو تم بیت المقدس جانا چاہتے تھے۔ اس سے بہتر موقع نہیں آسکتا"

حیرون:۔ "کیا خانقاہ کے لوگ تمہارے راہب کو لینے آئے ہیں؟"

عذرا:۔ ہاں، لیکن تم اسکی جگہ چلے جاؤ۔ راہب کا یہ لباس پہن لو۔ رات کی تاریکی میں وہ تمہیں نہ پہچان سکیں گے، اور جب صبح کو خانقاہ پہونچ کر معلوم ہوگا کہ تم ہو، تو وہ تمہیں آزاد کردیں گے، کیونکہ ایک یہودی خانقاہ کے اندر نہیں رہ سکتا۔ پہلے تو حیرون کو کچھ تامل ہوا، لیکن پھر یہ خیال کرکے کہ عذرا کی مسرت اسی میں ہے اور علاوہ اسکے وہ اس ذریعہ سے بیت المقدس تک پہونچ بھی جائیگا، اسپر راضی ہوگیا۔

حیرون نے راہب کا لباس پہنا ہی تھا، کہ دروازہ کھولکر متعاقبین آگئے۔ عذرا نے کہا کہ "وہ یہاں نہیں ہے" لیکن اس سے انھیں اور یقین ہوگیا اور آگے بڑھ کر حیرون کو جو راہب کے لباس میں تھا گرفتار کرلیا اور نیچے لیجاکر گاڑی میں بٹھایا اور چلدیئے۔

صبح کو جبکہ آفتاب کی زرین شعاعیں جزیکو کے میدان پر ہلکی ہلکی پڑ رہی تھیں، بحر مردہ میں ایک کشتی دو جلا وطن ہستیوں کو حدود شام سے دور، خدا جانے کہاں لئے جارہی تھی، اور پانی کی لہریں اس افسانہ محبت کو کسی ایسی جگہ منتقل کر رہی تھیں جہاں وہ آزادی کے ساتھ تکمیل تک پہونچ سکے۔

عورت کا پہلا آنسو مرجاں ہے، دوسرا گوہر اور تیسرا خالی آنسو!

ہر آدمی پیدائشی بیوقوف ہے، لیکن اُسے اس کا یقین دلانے کے لئے ایک عورت کی ضرورت ہوتی ہے۔

بیکار گفتگو میں ہم اس سے زیادہ دلچسپ نہیں ہوتے جس قدر اپنی خاموشی میں۔ ل احمد

محبت کائنات پر مسلط ہے لیکن اسکا موزوں ترین نشیمن ایک دوشیزہ کا سینہ ہے۔

محبت خیر شکل ہے، لیکن اسکی بہترین مظہر دو چیزیں ہیں، ایک کسی ناکام محبت کا اشکِ خموش، دوسری کسی دوشیزہ کا خندۂ دلفنا

مخمور

عنترہ بن شدّاد

(از ابو المحاسن مولوی محمود علی)

یہ مضمون، جناب ابو المحاسن مولوی محمود علی صاحب کا ہے، جو نصاب نظامی کے فاضل، عربی زبان کے نہایت اچھے ادیب اور میرے نہایت ہی مخلص دوست ہیں۔ آپ باوجود مولوی ہونیکے، بے انتہا زندہ دل اور حد درجہ روشن خیال ہیں۔ آپ سرکار بھوپال کے وظیفہ خوار ہیں اور اسی شعبۂ تصنیف و تالیف سے وابستہ ہیں، جسکا ایک فرد میں بھی ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ ناظرین نگار، اس مضمون کو دلچسپی سے پڑھیں گے، کیونکہ اُردو ادب کی بہترین خدمت یہی ہے کہ اسکے ذریعہ سے غیر زبانوں کے خیالات (خواہ وہ فلسفہ سے متعلق ہوں یا لٹریچر سے) بہ کثرت شائع کئے جائیں (اڈیٹر)

عنترہ بن شداد عبسی، جسکا زمانہ ظہور اسلام سے سات سال قبل تھا، شعراء عرب کے طبقۂ اولیٰ میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ شاعر، اُس سرزمین حُسن و محبت میں پیدا ہوا تھا، جو نجد کہلاتی ہے اور اسکا تعلق اس قبیلۂ بنی عبس سے تھا، جو ایام عرب میں اپنی بہت سی خصوصیات کی وجہ سے اک نمایاں امتیاز کا مالک تھا۔

اسکی ماں ایک سیاہ فام کنیز تھی، جسے اسکا باپ کسی لڑائی میں پکڑ لایا تھا۔ ماں کی وجہ سے عنترہ کا رنگ بھی حبشیوں کی طرح سیاہ تھا، جس کی وہ تعریف کرتا ہے:۔

يُعَيِّبُونِي لَوْنِي بِالسَّوَادِ جِهَالَةً	لوگ اپنے جہل و نادانی سے میرے رنگ پر سیاہی کا عیب لگاتے ہیں
وَلَوْلَا سَوَادُ اللَّيْلِ مَا طَلَعَ الْفَجْرُ[1]	درانحالیکہ اگر رات کی سیاہی نہ ہوتی تو صبح کبھی نمودار نہ ہوتی۔

[1] ابو اسحاق ابراہیم حرانی نے جو صابی المذہب تھا، سیاہ رنگ کی تعریف زیادہ حُسن کے ساتھ بیان کی ہے۔ اسکا ایک غلام یُمن بہت سیاہ فام تھا، اُس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

قد قال يمن وهو اسود للذي ۔۔۔ ببياضه استعلى علو الخائن
ما فخر وجهك بالبياض وهل ترى ۔۔۔ ان قد افدت به مزيد محاسن
ولو ان مني فيه خالا زانه ۔۔۔ ولو ان منه في خالا شانني

یعنی یُمن نے جو سیاہ فام ہے ایک گورے شخص سے کہا کہ تجھے اپنے سپید رنگ پر فخر کرنیکی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ اس سے تیرے محاسن میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اگر میرے رنگ سے بمقدار ایک تل کے بھی تجھے ملجائے تو تیری زینت بڑھجائے اور اگر تیرے رنگ کا ایک نقطہ بھی میرے رنگ پر پڑجائے، تو میں بدنما ہوجاؤں۔"

دوسری جگہ وہ ان الفاظ میں سراہتا ہے:۔

فيه معنى من البدر ولكن ۔۔۔ نفضت صبغها عليه الليالي
لم يشنك السواد بل زدت حسنا ۔۔۔ انما يلبس السواد الموالي

اس چہرہ میں تو بدر کامل کے معنے پنہاں ہیں، جسپر راتوں نے اپنا رنگ پھیلا دیا ہے، سیاہی نے تجھے بدنما نہیں کیا، بلکہ تیرا حسن اور زیادہ ہو گیا ہے، کیونکہ سیاہ رنگ ہی وہ رنگ ہے جسے موالی سردار پہنا کرتے ہیں،، اڈیٹر

عرب میں دستور تھا کہ کنیز زادہ کو اپنی طرف منسوب نہیں کرتے تھے، بلکہ اُسے غلام بنا لیتے تھے چنانچہ اسی دستور کے مطابق، عنترہ کا شمار بھی غلاموں میں تھا اور وہ غلاموں ہی کیطرح ذلیل زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔

ایک مرتبہ عرب کے کسی قبیلہ نے بنی عبس پر حملہ کیا اور بہت سے آدمیوں کو قتل کر کے، عورتیں اور مویشی پکڑ لے گئے۔ چونکہ عنترہ غلام تھا، اسلیئے اسنے قصداً بنی عبس کی مدد نہیں کی۔ اسکا باپ شداد اسکے پاس گیا اور کہا کہ تمہیں بھی ہمارے ساتھ جنگ میں شریک ہونا چاہیئے۔ عنترہ نے جواب دیا کہ "میں تو ایک ذلیل غلام ہوں اور میرا کام صرف مویشی چرانا ہے"۔ باپ نے کہا "اچھا ہم نے تمہیں آزاد کیا"۔ یہ سنکر عنترہ نے دشمن پر حملہ کیا، جسے دیکھکر قبیلہ بنی عبس کے اور لوگوں کو بھی غیرت آئی۔ عنترہ نے اس جنگ میں بہادری کے خوب خوب جوہر دکھائے اور دشمن کو شکست دیکر تمام مال غنیمت چھین لیا۔ باپ نے جب عنترہ کا یہ شاندار کارنامہ دیکھا، تو بہت خوش ہوا اور سب کے سامنے کہا کہ "عنترہ، میرا بیٹا ہے"۔ اسکے بعد عنترہ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا اور اسکی شجاعت، بلند ہمتی، عزت نفس تمام عرب میں مشہور ہو گئی۔

اسلام سے قبل، عرب کا دستور تھا کہ جب کسی قبیلہ کے پاس کچھ کھانے کو نہ رہتا، تو دوسرے قبیلہ پر حملہ کر کے اسکا مال و اسباب لوٹ لیتے، اسی لئے وہ شخص جو زیادہ شجاع ہوتا تھا، ایسے معرکوں میں حصہ لیتا تھا اور وہی بڑا عزت والا خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ عنترہ خود لکھتا ہے:۔

لَعَمْرُكَ اِنَّ الْمَجْدَ وَالْفَخْرَ وَالْعُلٰى
وَنَيْلَ الْاَمَانِىْ وَارْتِفَاعَ الْمَرَاتِبِ
لِمَنْ يَلْتَقِىْ اَبْطَالَهَا وَسَرَاتَهَا
بِقَلْبٍ صَبُوْرٍ عِنْدَ وَقْعِ الْمَضَارِبِ
وَيَبْنِىْ بِحَدِّ السَّيْفِ مَجْدًا مُشَيَّدًا
عَلٰى فَلَكِ الْعَلْيَاءِ فَوْقَ الْكَوَاكِبِ

تیری عمر کی قسم، بزرگی، فخر، علو ئے مرتبہ، مقاصد کا حصول اور مرتبوں کی بلندی، صرف اس شخص کا حصہ ہوتی ہے، جو ان صفات کے مالکوں، بہادروں اور سرداروں سے شمشیر زنی کے وقت نہایت استقلال سے مقابلہ کرے، اور تلوار کی دہار سے ایسے بلند مرتبہ والی عظمت کی بنیاد قایم کرے، جو آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ بلند ہو۔

عنترہ میں بھی، شجاعت، اقدام جری، ثبات حربی، جو جاہلیت عرب کے تنہا فضایل تھے، بدرجہ کمال موجود تھے۔ وہ اپنے زمانہ کی تمام مشہور لڑائیوں میں شریک ہوا، جس کی سرگذشت نہایت دلچسپ ہے۔

یوسف بن اسمٰعیل مصری نے (جو روایات عرب میں، ابو عبیدہ، محمد بن ہشام، اور اصمعی

کا شاگرد ہے) عنترہ کی تمام لڑائیوں کا قصہ نہایت دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔

عنترہ، صرف بہادر و شجاع ہی نہ تھا، بلکہ عرب کا فصیح ترین شاعر بھی تھا۔ اسکا کلام ان ثقیل الفاظ سے خالی ہے، جو اکثر شعراء جاہلیت کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ اسکا طرز بیان اور اندازِ تعبیر بھی سب سے نرالا تھا۔ حسنِ تخیل، نزاکتِ مضمون، تصرفِ معانی، لطافتِ تشبیہہ، حلاوتِ بیان، یہ سب کچھ اسکے حصہ میں تھا اور چونکہ اسکے دل میں محبت کا شریف جذبہ بھی موجود تھا، اسلئے اس کا کلام حسیاتِ قلب کی بھی بہترین تصویر ہے۔

عنترہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ باوجود شاعرِ جاہلیت ہونے کے، اسکے کلام میں وہ عریانی نہیں ہے، جو آدابِ شاعری اور ذوقِ لطیف کے منافی ہو۔ امراء القیس، جو عرب کا ملک الشعراء خیال کیا جاتا ہے، ہر چند بلند طبقہ کا شخص (یعنی شاہزادہ) تھا، لیکن اسکے کلام میں بعض مواقع پر اسقدر عریانی ہوجاتی ہے کہ مہذب طبائع اسکا سننا گوارا نہیں کر سکتے، برخلاف اسکے آپ عنترہ کا سارا دیوان پڑھ جائیے، لیکن آپ کو کوئی شعر ایسا نہ ملیگا جو لطیف طبائع پر گراں ہو۔

عنترہ کو اپنی عم زاد بہن عبلہ بنت مالک سے بہت محبت تھی۔ عرب میں دستور تھا کہ اگر لڑکی والے کو معلوم ہوجاتا کہ فلاں شخص میری لڑکی سے محبت کرتا ہے، تو کبھی اسکے ساتھ عقد نہ کرتا۔ چنانچہ عنترہ کو بھی ابتداء میں یہی مشکلات پیش آئیں۔ بڑی کوششوں کے بعد، عبلہ کا باپ نکاح کر دینے پر راضی ہوا، لیکن شرط یہ کی کہ مہر میں عراق کی بہترین اونٹنیاں دیجائیں۔ غریب عنترہ، یہ شرط پوری کرنے کیلئے عراق پہونچا، لیکن یہاں بدقسمتی سے اسکو منذر بن ماء السماء نے جو عراق کا بادشاہ تھا، قید کر لیا اور اسکے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں ڈالدیں۔ عنترہ نے اسی عالم میں، عبلہ کی یاد اور اسکے وداعی الفاظ کو اسطرح ظاہر کیا ہے:۔

جفونُ العذاری مِن خلالِ البراقعِ
احدُّ من البیضِ الرقاقِ القواطعِ
اذا جرّدت ذلّ الشجاعُ واصبحت
محاجرہٗ قرحیٰ بفیضِ المدامعِ
لقد ودّعتنی عبلۃُ یومَ بینھا
وداعَ یقینٍ انّنی غیرُ راجعِ

کنواریوں کی پلکیں، نقاب کے اندر بھی، درخشاں، باریک اور کاٹنے والی تلواروں سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہیں۔

جب یہ تلواریں (پلکیں) عریاں ہوتی ہیں، تو بڑے بڑے بہادر سرنگوں ہوجاتے ہیں اور انکی آنکھیں فرطِ گریہ سے مجروح ہوجاتی ہیں عبلہ نے فراق کے دن مجھے رخصت کیا اور اسے یقین تھا کہ میں اب کبھی واپس نہ ہوسکوں گا۔

وَنَاحَتْ وَقَالَتْ كَيْفَ تُصْبِحُ بَعْدَنَا
إِذَا غِبْتَ عَنَّا فِي الْقِفَارِ الشَّوَاسِعِ
فَكُنْ وَاثِقًا مِنِّي بِحُسْنِ مَوَدَّةٍ
وَعِشْ نَاعِمًا فِي غِبْطَةٍ غَيْرِ جَازِعِ

وہ رونے لگی اور بولی کہ تم ہمارے بعد اپنا وقت کس طرح گذاروگے، جب کہ تم دور و دراز صحراؤں میں ہم سے دُور ہوگے۔ (بہر حال) میری طرف سے حسن محبت کا یقین رکھو اور آرام و امن سے قابل رشک زندگی بسر کرو۔

أَيَا عَلَمَ السَّعْدِيِّ هَلْ أَنَا رَاجِعٌ
وَأَنْظُرُ فِي قُطْرَيْكَ زَهْرَ الْأَرَاجِعِ

اے جبل سعدی، کیا میں پھر کبھی واپس آؤنگا اور تیرے اطراف میں موسم بہار کے کھلے ہوئے پھولوں کو نظارہ کرسکوں گا؟

اسکے بعد عنترہ، ایک زمانہ تک قید کے مصائب برداشت کرتا رہا۔ پھر بڑی مشکلوں سے، رہا ہوا اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہوکر نوے سال کی عمر تک جیا۔

۲

عام خیال ہے کہ عرب، چونکہ غیر متمدن وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے، اسلئے اُنکے اشعار میں، لطافت، تشبیہ، رقت معانی، اور حسن تعبیر ایسا نہیں پایا جاتا، جو اک متمدن ملک کے بوقلموں مناظر دیکھنے والے شاعر کے کلام میں ہوسکتا ہے، لیکن اگر شعراء عرب کے کلام کا استقصار کیا جائے، تو معلوم ہوسکتا ہے کہ باوجود غیر متمدن اور وحشی ہونیکے، انکے کلام میں وہ لطیف استعارات، نازک تشبیہات اور نادر اسلوب بیان پایا جاتا ہے، جو دوسری قوموں کے شعراء کو اگر حاصل ہوا بھی ہے، تو اسوقت جب وہ تمدن کے تمام مدارج طے کرچکے تھے۔

اب ہم جابجا سے کلام عنترہ کا اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے ہمارے اس قول کی پوری تصدیق ہوسکتی ہے۔ تشبیہ کی خوبی یہ ہے کہ وجہ شبہ، جسقدر مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان زیادہ مشترک ہوگی اور جسقدر انمیں تناسب معنوی زیادہ ہوگا، اسی قدر وہ زیادہ لطیف ہوگی۔ ایک جگہ عنترہ کہتا ہے:۔

وَرَنَتْ فَقُلْتُ غَزَالَةٌ مَذْعُورَةٌ
قَدْ رَاعَهَا وَسْطَ الْفَلَاةِ بَلَاءُ

محبوبہ نے دیکھا، تو میں نے کہا کہ یہ کوئی خوفزدہ ہرنی ہے، جسے وسط صحرا میں کسی خوفناک شے نے ڈرا دیا ہے۔

محبوبہ کی تشبیہ خوف زدہ ہرن سے جیسی مکمل ہے، محتاج بیان نہیں۔ محبوبہ جب اپنے عاشق کو دیکھتی ہے تو اسکی نگاہوں اور اداؤں میں بالکل اسی قسم کی وحشت پیدا ہو جاتی ہے، جیسے ایک خوفزدہ ہرن کی، کیونکہ اسکو بھی یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کوئی دیکھتا نہ ہو۔ دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

وَبَدَتْ فَقُلْتُ الْبَدْرُ لَيْلَةَ تِمِّهِ
قَدْ قَلَّدَتْهُ نُجُومَهَا الْجَوْزَاءُ

جب وہ ظاہر ہوئی، تو میں نے کہا یہ تو چودھویں رات کا چاند ہے، جسے جوزا نے اپنے ستاروں کا ہار پہنا دیا ہے۔

اس شعر میں عنترہ نے، چہرۂ محبوب کو چاند سے تشبیہ دی ہے، جو اک عام تشبیہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ دوسری تشبیہ بھی ہے، جسکا مشبہ مذکور نہیں ہے، یعنی محبوبہ موتیوں کا ہار بھی پہنے ہوئے ہے، جسکو اسنے نجوم جوزا سے تعبیر کیا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود صرف چاند سے تشبیہ دینا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعر کا مدعا اس شعر میں، صرف ہار کی خوبی ظاہر کرنی تھی، جسے نہایت لطیف استعارہ کی صورت میں بیان کر گیا۔

ایک موقعہ پر عنترہ، میدان جنگ کا نقشہ اسطرح پیش کرتا ہے:۔

تَطِيرُ رُؤُوسُ الْقَوْمِ تَحْتَ ظَلَامِهَا
وَتَنْقَضُّ فِيهَا كَالنُّجُومِ الثَّوَاقِبِ
وَتَلْمَعُ فِيهَا الْبِيضُ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ
كَلَمْعِ بُرُوقٍ فِي ظَلَامِ الْغَيَاهِبِ

غبار لشکر کے نیچے، لوگوں کے سر اسطرح اڑتے اور سرعت کے ساتھ گرتے ہیں، گویا وہ شہاب ثاقب ہیں۔
اور اسمیں سپید تلواریں ہر طرف سے اسطرح چمک رہی ہیں، جیسے سخت اندھیری میں بجلیاں کوندتی ہیں۔

چونکہ حماست، خاص عنترہ کے ذوق کی چیز ہے، اسلئے اشعارِ مذکورۂ بالا میں، اسنے جس جوش سے کام لیا ہے، اور مشبہ بہ جسقدر موزوں تلاش کیا ہے، وہ اربابِ فہم سے مخفی نہیں۔ چونکہ منظر کی ہیبت لوگوں پر ظاہر کرنی مقصود تھی، اسلئے مشبہ بہ اسی انداز کا تلاش کیا اور یہی ہے اصل بلاغت، جو ہر شاعر کا حصہ نہیں ہوتی۔

ذیل کے اشعار میں، عنترہ نے، شاہدانِ روشن طلعت کو جدا جدا دو تشبیہوں سے ظاہر کیا ہے اور ان میں سے ہر تشبیہ اپنی جگہ نہایت مکمل ہے۔ لکھتا ہے:۔

لِمَنِ الشُّمُوسُ عَزِيزَةُ الْأَحْدَاجِ
يَطْلُعْنَ بَيْنَ الْوَشْيِ وَالدِّيبَاجِ
مِنْ كُلِّ فَائِقَةِ الْجَمَالِ كَدُمْيَةٍ
مِنْ لُؤْلُؤٍ قَدْ صُوِّرَتْ فِي عَاجِ

سواریوں پر یہ کس کے آفتاب ہیں، جنہیں مردوں کی طرف ذرا التفات نہیں؟ (ہاں) یہ وہ آفتاب ہیں جو حریر و دیبا کے لباس سے طلوع ہوتے ہیں۔ انمیں سے ہر ایک جمال فائقہ کی مالک ہے اور ان موتیوں کیطرح ہے، جو عاج میں بنائے جاتے ہیں۔

پہلا شعر استعارہ کی بڑی دلکش مثال ہے اور دوسرے شعر میں جو تشبیہ پیش کی گئی ہے، وہ اپنی جدت

ندرت کے لحاظ سے خوب ہے، کسی حسین صورت کو دیکھ کر یہ کہنا کہ وہ تختۂ عاج پر موتی کی تصویر ہے، نزاکتِ تخیل کا نہایت پیارا نمونہ ہے۔

أَشَارَتْ إِلَيْهَا الشَّمْسُ عِنْدَ غُرُوبِهَا
تَقُولُ إِذَا اسْوَدَّ الدُّجَى فَاطْلُعِي بَعْدِي
فَقَالَ لَهَا الْبَدْرُ الْمُنِيرُ أَلَا اسْفِرِي
فَإِنَّكِ مِثْلِي فِي الْكَمَالِ وَفِي السَّعْدِ
فَوَلَّتْ حَيَاءً ثُمَّ أَرْخَتْ لِثَامَهَا
وَقَدْ نَثَرَتْ مِنْ خَدِّهَا رَطْبَ الْوَرْدِ

غروب ہوتے وقت، آفتاب نے اسکی طرف اشارہ کرکے کہا کہ میرے بعد جب تاریکی بڑھ جائے تو تو طلوع ہو جانا، اور بدرِ منیر نے اس سے کہا کہ تو رُخ سے نقاب کیوں نہیں اُٹھا دیتی کیونکہ کمال و سعد میں تو بھی میری ہی طرح ہے (یہ سنکر) اس نے مارے شرم کے پیٹھ پھیر لی، نقاب چہرہ پر ڈالا اور اپنے رخسار سے تازہ گلاب بکھیرتی ہوئی چلی گئی۔

یوں تو، تینوں شعر اپنی اپنی جگہ اندازِ بیان کا بہترین نمونہ ہیں، لیکن خصوصیت کے ساتھ تیسرا شعر بہت زیادہ قابلِ تعریف ہے، جسمیں حیا آلود رخساروں کی حالت تازہ گلاب بکھیرنے سے ظاہر کیگئی ہے۔ حالتِ انفعال میں جو سرخی رخساروں پر نمودار ہو جاتی ہے اسکے ظاہر کرنے کیلئے یہ اندازِ بیان تلاش کرنا جس میں بہترین استعارہ بھی پایا جائے کمالِ شاعری میں داخل ہے۔

مشبہ ہیں، وجہ شبہ بہ نسبت مشبہ بہ کے ذرا کمزور ہوا کرتی ہے، یعنی جو وصفِ مشترک، مدارِ تشبیہ ہے، وہ مشبہ بہ میں، بہ نسبت مشبہ کے زیادہ قوی پایا جاتا ہے۔ نیچے کے شعر میں، عنترہ نے ثابت کیا ہے کہ چشمِ آہو کی خوش نمائی اور اس کی سحر طرازی ایسی نہیں ہے کہ اس سے چشمِ محبوب کو تشبیہ دیجائے، بلکہ خود چشمِ آہو نے اپنا سحر اُس سے مستعار لیا ہے۔ لکھتا ہے:۔

؂ محبوب کے چہرہ کو چاند سے تشبیہ دینا، تمام ممالک میں رائج ہے، چنانچہ شعراء عرب نے بھی اکثر اس خیال کو ظاہر کیا ہے اور ہر شاعر نے اندازِ بیان میں ندرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ عنترہ کا یہ شعر جو فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے، خوب ہے، لیکن بدیع الزماں، ایک جگہ اسی مضمون کو جس خوبی کے ساتھ ادا کر گیا ہے، وہ اسی کا حصہ ہے، لکھتا ہے:۔

لَوْ قِيلَ لِلْبَدْرِ مَنْ فِي الْأَرْضِ تَحْسُدُهُ ۔۔۔ اذا تجلّی، لَقَالَ بِنْتُ الْفُلَانِي

یعنی جس وقت چودھویں رات کا چاند خوب چمک رہا ہو اگر تم اس سے پوچھو گے کہ زمین میں تجھے کس پر رشک آتا ہے، تو وہ فوراً کہدے گا کہ فلاں شخص کی لڑکی پر۔

اڈیٹر

أَغَارَتْ لِلظَّبْيِ سِحْرَ مُقْلَتِهَا وَبَاتَ لَيْثُ الشَّرَى عَلَى حَذَرٍ	محبوبہ نے ہرن کو اپنی آنکھوں کا سحر مستعار دیا ہے، اور مقام شَرٰی (جہاں کے شیر مشہور ہیں) کے شیر اب خائف رہتے ہیں کہ کہیں وہ ہمارا شکار نہ کرلے۔

دوسرے مصرعہ میں ایک اور لطیف بات بھی بیان کی ہے۔ یعنی شاعر، بہادر آدمیوں کو شیر سے تشبیہ دیکر کہتا ہے کہ عام طور پر تو شیر ہرن کا شکار کیا کرتے ہیں، مگر محبوب عجیب قسم کا ہرن ہے کہ شیر (یعنی بہادر لوگ) بھی اس سے ڈرتے ہیں کہ کہیں اسکا شکار نہ ہو جائیں ؎۱

تشبیہ مرکب کا رواج عربوں میں بہت تھا اور واقعہ یہ ہے کہ شعراء عرب نے اس مخصوص تشبیہ کے بڑے بڑے نادر نمونے پیش کئے ہیں، لیکن ظلم ہوگا اگر اسی سلسلہ میں عنترہ کا ایک شعر نہ لکھا جائے، جو تشبیہ مرکب کی نہایت خوبصورت مثال ہے۔ لکھتا ہے:۔

تُرِيكَ وَهِيَ ثَغْرِهَا إِذَا ابْتَسَمَتْ كَأْسَ مُدَامٍ قَدْ حُفَّ بِالدُّرَرِ	وہ تبسم کی حالت میں ایسا جام شراب پیش کرتی ہے، جو موتیوں سے بھرا ہے (یا جڑا ہوا ہے) ؎۲

عرب میں بت پرستی کا عام رواج تھا، چنانچہ عنترہ کی محبوبہ، عبلہ بھی، جو خود ایک مجسمہ حسن تھی، پرستش اصنام کیلئے جاتی تھی، لیکن عنترہ اس پرستش کو کس نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اسکا ذکر اس شعر میں ہے:۔

سَجَدَتْ تُعَظِّمُ رَبَّهَا فَتَمَايَلَتْ لِجَلَالِهَا أَرْبَابُنَا الْعُظَمَاءُ	جب وہ بت کے آگے اظہار تعظیم میں جھکی، تو اسکے جلال (حسن) کے سامنے ہمارے تمام بت سرنگوں ہو کر رہ گئے۔

؎۱ چنانچہ عین الزماں لکھتا ہے:۔

أَذَلَّنِي بَعْدَ عِزِّ الْهَوَى أَبَدًا ۔۔۔ يَسْتَعْبِدُ اللَّيْثَ لِلظَّبْيِ الْكِنَاسِي

یعنی میں تو بڑا عزت والا مغرور شخص تھا، لیکن اسنے مجھکو بالکل دبا لیا۔ عشق ایسی ہی چیز ہے جو شیروں کو بھی (جھاڑیوں میں پھرنے والے) ہرن کا غلام بنا دیتا ہے۔ (ایڈیٹر)

؎۲ عبد الحکم نے بھی دانتوں کو موتیوں سے تشبیہ دی ہے، لیکن عجیب انداز بیان سے۔ لکھتا ہے:۔

قَامَتْ تُطَالِبُنِي بِلُؤْلُؤِ نَحْرِهَا ۔۔۔ لَمَّا رَأَتْ عَيْنِي تَجُودُ بِدُرِّهَا

وَتَبَسَّمَتْ عَجَبًا فَقُلْتُ لِصَاحِبِي ۔۔۔ هَذَا الَّذِي تُهِمَتْ بِهِ فِي ثَغْرِهَا

جب اسنے دیکھا کہ میری آنکھیں آنسو کے موتی برسا رہی ہیں، تو وہ کھڑی ہو کر اپنی گردن کا ہار (جو کھو گیا تھا) مجھ سے مانگنے لگی۔ اسکے بعد جب وہ مسکرائی تو میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ دیکھو جس چیز کی تہمت اسنے مجھ پر لگائی تھی، وہ خود اسکے دہن میں موجود ہے۔
ایڈیٹر

آپ محسوس کرینگے کہ باوجود شاعری کی تمام صنعتوں کا خیال رکھنے کے، عنترہ، عاشقانہ جذبات سے کہیں انحراف نہیں کرتا اور جہاں کہیں وہ خالص جذباتِ محبت نظم کرجاتا ہے، تو پھر اسکے بیان کی افتادگی دیدنی نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

وَأَلْثِمُ أَرْضاً أَنْتِ فِيهَا مُقِيمَةٌ
لَعَلَّ لَهِيبِي مِنْ ثَرَى الأَرْضِ يَبْرُدُ

میں اس زمین کو چومتا ہوں، جہاں وہ مقیم ہے کہ شاید اسیطرح میری آتش شوق اس زمین کے چومنے سے سرد ہو جائے۔

عنترہ، چونکہ نہایت بہادر شخص تھا اور عرب کی اکثر لڑائیوں میں اسنے دادِ شجاعت دی تھی، اسلئے حماست میں بھی اسنے عجیب عجیب اشعار کہے ہیں۔ لکھتا ہے:۔

فَتَى يَخُوضُ غُبَارَ الحَرْبِ مُبْتَسِماً
وَيَنْثَنِي وَسِنَانُ الرُّمْحِ مُخْتَضِبُ
إِنْ سَلَّ صَارِمَهُ سَالَتْ مَضَارِبُهُ
وَأَشْرَقَ الجَوُّ وَانْشَقَّتْ لَهُ الحُجُبُ
لِي النُّفُوسُ لِلطَّيْرِ اللُّحُومُ وَلِلْ
وَحْشِ العِظَامُ وَلِلْخَيَّالَةِ السَّلَبُ
أَسُودُ غَابٍ وَلَكِنْ لَا نُيُوبَ لَهُمْ
إِلَّا الأَسِنَّةُ وَالْهِنْدِيَّةُ القُضُبُ

میں وہ جوان ہوں کہ غبارِ جنگ میں مسکراتا ہوا داخل ہوتا ہوں اور اس حال میں واپس آتا ہوں کہ نیزہ کی انی خون سے رنگین ہوتی ہے اور جب اپنی تلوار عریاں کرتا ہوں تو اسکی دھار سے دشمنوں کا خون بہتا ہوتا ہے، فضا چمک اٹھتی ہے اور کوئی حجاب باقی نہیں رہتا۔ میرے حصہ میں دشمنوں کی جانیں ہیں، پرندوں کے حصہ میں گوشت، درندوں کے حصہ میں ہڈیاں اور سوارانِ لشکر کے حصہ میں مالِ غنیمت، وہ سوار جنگل کے شیر ہیں، انکے دانت صرف نیزہ کی انی اور کاٹنے والی تلواریں ہیں۔

خُلِقْتُ لِلْحَرْبِ أُحْمِيهَا إِذَا بَرَدَتْ
وَأَصْطَلِي نَارَهَا فِي شِدَّةِ اللَّهَبِ
بِصَارِمٍ حَيْثُمَا جَرَّدْتُهُ سَجَدَتْ
لَهُ جَبَابِرَةُ الأَعْجَامِ وَالعَرَبِ

میں لڑائی کیلئے پیدا ہوا ہوں۔ (چنانچہ) جب وہ ٹھنڈی ہو جاتی ہے تو میں اسے گرم کرتا ہوں اور جب نارِ حرب شدت سے بھڑک اٹھتی ہے، تو میں اس سے تاپتا ہوں۔ اور میری ہاتھ میں ایسی تلوار ہوتی ہے کہ جب میں اسے برہنہ کرتا ہوں تو عرب و عجم کے بڑے بڑے بہادر اسے سجدہ کرنے لگتے ہیں۔

نَدِيمِي رَعَاكَ اللهُ قُمْ غَنِّ لِي عَلَى
كُؤُوسِ المَنَايَا مِنْ دَمٍ حِينَ أَشْرَبُ
وَلَا تَسْقِنِي كَأْسَ المُدَامِ فَإِنَّهَا
يَضِلُّ بِهَا عَقْلُ الشُّجَاعِ وَيَذْهَبُ

اے ندیم (خدا تیری حفاظت کرے) جب میں خونابۂ موت پیوں، تو اسوقت تو نغمہ سرائی کر، اور مجھے ساغرِ شراب نہ پلا، کیونکہ اس سے بہادر کی عقل (بجائے زیادہ ہونے کے) اور زائل ہو جاتی ہے۔

سحرِ بنگالہ

(ایک تقریر جمیل کی یاد میں)

از: مخمورؔ اکبر آبادی

وہ برقِ تبسم، مری ہستی کو جلادے! وہ سحرِ نگہ، ہاں، مجھے دیوانہ بنادے؛
وہ زلف، مجھے دامِ تمنا میں پھنسادے؛ سوئی ہوئی قسمت کو مری، اور سلادے!
کھویا سا رہوں، عالمِ وحشت کی فضا میں؛
اک حشر بپا ہو، دلِ آشفتہ ادا میں!

اُف یاد ہے، اُس رات کا نظارۂ تاباں، جب حُسن کے جلووں سے تھا لبریز وہ ایواں؛
موجود جو تھا سمع نوازی کا بھی ساماں، ہر دل ہمہ تن شوق تھا، ہر چشم تھی حیراں؛
اب کیا کہوں جو حالتِ قلبِ نگراں تھی؛
جنبش تھی مژہ میں، مگر آنکھوں کو گراں تھی!

بجلی کی وہ تابش کہ نظر جمنی تھی مشکل، وہ ریزشِ لمعات، وہ انوار کی جھلمل
اک جلوہ گہ حسن تھا، ہر گوشۂ محفل؛ گویا کہ نہ تھی حایلِ در، چلمنِ محمل،
اس رمز کے عالم میں سکون لطف فزا تھا؛
آنکھیں لئے ہر شخص پئے نذر کھڑا تھا!

وہ لحنِ خوشی تھا کہ موسیقیِ فطرت، وہ جذب فسوں زا تھا کہ تلقینِ ارادت،
سحرِ نگہ شوخ کی وہ طرفہ شرارت، ہر عشوۂ پنہاں سے عیاں درسِ محبت،
ذوقِ نظرِ حسن نگر، محوِ الم تھا
دل شوق میں پامالِ مسرات ستم تھا

اب جبکہ مبدل بہ تکلم تھی خموشی،
بیتاب بہ مسرت تھی حسِ نغمہ نیوشی،
ہر جنبشِ لب، منظرِ تسنیم فروشی،
ہر لفظ میں پنہاں تھا ہمہ عربدہ کوشی،

حیرت میں کوئی پڑ گیا، خامش ہوا کوئی،
لذت میں کوئی چور، تو سرخوش ہوا کوئی!

اُف، یہ وہ قیامت تھی، جو گذری مرے سر سے،
ہاں، یہ وہ تماشا تھا، جو دیکھا ہے نظر سے،
شب گم سا رہا، سحرِ ترنم کے اثر سے،
اب یاد میں ہوں اسکے میں بیتاب سحر سے،

گو آنکھ سے اوجھل ہیں وہ مسرور ادائیں،
کانوں میں بھری ہیں، مگر اب تک وہ صدائیں!

غزل

(از: نیاز فتحپوری)

عرضہ مدہ کنوں بہ او طرحِ فسونِ ناز را
اے کہ خراب ساختی از نگہت نیاز را
شمع کجا بہ بزم او بینم وہاں، ز دیدہ، من
می شنوم فسانۂ جلوۂ جاں گداز را
تو ہمہ غفلت آمدی عشقِ فسوں پذیر را
من ہمہ شوق آمدم حسنِ کرشمہ ساز را
خوش سحرے کہ خواب را ختم کنی و من خشم
از دو لبم شرابِ آں نرگسِ نیم باز را
گر نہ رسد بہ دیگراں جورِ خلوص پرورت
من نہ کنم گہے گلہ لطفِ ستم طراز را
من بہ حضورِ خلوتت گریہ چساں فرو خورم
آہ، کجا برم کنوں سیلِ نوائے راز را
شد سحرے ولے چہ شد من بروم بہ خوابِ مرگ
ہاں ندہم ز کف کنوں، زلفِ شبِ دراز را
دست ہمیں کشم از و آہ، ولے علاج چیست
ایں دلِ بیقرار و آں چشمِ فسوں طراز را

انچہ بدیگراں کنی، آں بدلِ نیاز ہم
او ز تو خواستہ اند کے شیوۂ امتیاز را

معلومات

از نیاز فتحپوری

ہوائے منضغط Compressed air

آجکل ترقی کا اصل راز یہ ہے کہ انسانی قوت کو بڑھایا جائے اور کم سے کم زمانہ میں ایک کام کو انجام دیکر وقت کو وسیع کیا جائے، یعنی اگر ایک انسان صرف اپنے اعضاء سے کام لیکر کسی کام کو ایک دن میں کر سکتا ہے، تو اُسکے لئے دیگر عارضی قوتیں ایسی فراہم کی جائیں کہ وہ دس آدمی کا کام تنہا کر سکیں اور بجائے ایک دن کے ایک گھنٹہ یا اِس سے بھی کم وقت میں۔ اور یہی وہ مقصد ہے جس نے سائنس کی دُنیا میں ہلچل مچا رکھی ہے اور ہر وقت یہی فکر پیشِ نظر ہے کہ وقت کی تنگی کو کیونکر وسیع اور انسانی قوت کو کس طرح عظیم بنایا جائے اور اِسکے ساتھ زمین کی طنابوں کو کیونکر کھینچکر آنِ واحد میں تمام عالم امکان اور زمان و مکان کو ایک مٹھی میں کر لیا جائے۔

ریل، تار، جہاز، طیارے، لاسلکی، اور خدا جانے کیا کیا سب اسی ایک مدعا کو پورا کرنے کی غرض سے راتدن کام کر رہے ہیں اور انسان باوجود اِسکے کہ اُس نے تمام عناصر کو اپنے قبضہ میں کر لیا ہے، ابھی تک مطمئن نہیں ہے۔ ہوا سے جسقدر کام دُنیائے حکمت میں لئے جاتے ہیں، وہ کثیر اور عجیب و غریب ہیں اور انہیں میں سے ایک وہ ہے جو ہوائے منضغط سے لیا جاتا ہے۔

ہوائے منضغط ترجمہ ہے Compressed air کا۔ اِس سے مقصود وہ ہوا ہے جو قوت سے کام لیکر کسی ظرف میں بھر دیجائے۔ فٹ بال، سائیکل اور موٹر کے ٹائر میں یہی دبی ہوئی ہوا ہوتی ہے اِس ہوا کا ایک کام تو یہی ہے کہ جو ابھی ظاہر کیا گیا کہ وہ ربر کی کھوکھلی بنی ہوئی چیزوں کو اُنکا لوچ قایم رکھتے ہوئے سخت کر دیتی ہے (جیسے فٹ بال اور موٹر ٹائر وغیرہ) اور دوسرا کام یہ ہے کہ وہ ایک خادم کی طرح آپ کی چیزوں کو اِدھر سے اُدھر لے جا سکتی ہے، ہرکاروں کی طرح ڈاک کے تھیلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیتی ہے، اور ایک خاکروب کی طرح آپ کے کمروں، میزوں اور کرسیوں کو بھی جھاڑ دیتی ہے۔ امریکہ کے تمام بڑے بڑے شہروں میں کوئی اہم کارخانہ، ہوٹل، دفتر اخبار وغیرہ، اور ڈاک خانہ ایسا نہیں ہے، جہاں ہوا ایک ادنیٰ خادم کی طرح ہر وقت نہ دوڑ

رہی ہو۔

تم اگر نیویارک کے کسی بڑے ہوٹل میں جا کر قیام کرو گے، تو دیکھو گے کہ ہر کمرہ کے اندر دیوار کے گوشہ میں یا فرش پر تمہاری میز کے قریب ایک سوراخ ہے جسپر ایک ڈھکنا ڈھکا ہوا ہے اور عین اُسوقت جبکہ تم اپنی میز پر بیٹھے ہوئے ڈاک کا انتظار کر رہے ہو گے، وہ ڈھکنا دفعۃً کھُلجائے گا اور تمہاری ڈاک تمہارے سپرد کر کے پھر فوراً بند ہو جائیگا۔ تمکو بظاہر حیرت ہوگی، لیکن حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ یہ سوراخ ایک نلکی کا ہے جس کے اندر سے ہو کر دبی ہوئی ہوا تمہاری ڈاک کو اُڑا لاتی ہے۔

اگر تم نے کسی شہر میں ٹیلیفون کا دفتر اکسچنج دیکھا ہے، تو تمکو معلوم ہوگا کہ کیونکر اسی ایک جگہ سے تمام شہر کے مقامات کا باہم تعلق ہو جاتا ہے، اور کس طرح مشرقی حصہ کا رہنے والا مغربی حصہ کے آدمی سے گفتگو کر لیتا ہے، بالکل اسی طرح ہر بڑے ہوٹل میں ایک مرکزی مقام ہوتا ہے جہاں سے یہ تمام نلکیاں پھیلائی جاتی ہیں اور وہیں سے اُن کے اندر ہوا پر وزن ڈالا جاتا ہے تاکہ وہ دب کر اس چیز کو نلکی کے دوسرے سرے تک پہونچادے، جو اس کے اندر ڈالی گئی ہے۔

پھر ان نلکیوں سے صرف ڈاک ہی نہیں پہونچائی جاتی، بلکہ ملاقاتی کارڈ، رسیدات، چھوٹے چھوٹے بنڈل، روپیہ، پیسہ وغیرہ بھی پہونچائے جاتے ہیں۔

فرض کیجئے آپ باہر سے سیر و تفریح کے بعد ہوٹل میں آئے اور وہاں ہوٹل ہی کی کسی دوکان میں آپ نے ایک نوٹ دیکر کسی چیز کا آرڈر دیا کہ فلاں کمرہ میں پہونچادی جائے، تو آپ کے وہاں پہونچنے سے قبل آپ کے حکم کی تعمیل ہو چکی ہوگی، یعنی جسوقت آپ اپنی منزل میں پہونچیں گے، تو دیکھیں گے کہ آپ کی خریدی ہوئی چیز معہ رسید اور باقی رقم کے ایک بنڈل میں لپٹی ہوئی پڑی ہے اور یہ سب کچھ اسی ہوا کے ذریعہ سے عمل میں آیا ہے۔ چونکہ وہاں کے بعض ہوٹل پندرہ پندرہ منزل کے ہوتے ہیں، اس لئے اگر وہاں ان نلکیوں سے کام نہ لیا جائے تو ظاہر ہے کہ بہت سے آدمی ملازم رکھنے پڑیں اور پھر بھی اسقدر جلد کام نہو۔

اسی طرح اخباروں کے دفاتر میں بھی تمام کمروں کے اندر اسی ہوا سے کام لیا جاتا ہے۔ جنرل منیجر جو اخبار کے تمام شعبوں کا نگراں ہے، اسی ہوا کے ذریعہ سے ہر شعبہ کے منتظم کے پاس ہدایات کے کاغذات بھیجتا رہتا ہے۔ اگر وہ آدمیوں کے ذریعہ سے اطلاعات روانہ کرے تو بہت دیر ہو جائے اور اکثر صورتوں

میں اہم ترین خبریں اور اشتہار وقت پر شائع نہ ہو سکیں۔

بڑے بڑے شہروں میں جہاں سے متعدد اخبار شائع ہوتے ہیں ایک ایسوشی ایٹڈ پریس بھی قائم ہوتا ہے، جو تمام اہم خبریں، سوسائٹی کے اخباروں کو بہم پہونچاتا ہے، پھر چونکہ اسکا کام نہایت اہم ہے اور بعض اوقات نہایت طویل حالات و واقعات تمام اخباروں کو ایک ہی وقت میں پہونچانے پڑتے ہیں، اس لئے وہاں بھی اسی ہوا سے کام لیکر آنِ واحد میں تمام کاغذات ہر جگہ پہونچائے جاتے ہیں۔

امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں، ڈاک خانے بھی اسی ہوا سے کام لیتے ہیں۔ جسوقت مرکزی ڈاک خانہ، چھوٹے چھوٹے ماتحت ڈاک خانوں کو اُنکی متعلقہ ڈاک تقسیم کرتا ہے تو اسی ہوا کے ذریعہ سے۔ پھر ان ہوا کی نالیوں سے صرف خطوط ہی نہیں روانہ کئے جاتے، بلکہ کئی کئی سیر کے وزنی بنڈل بھی بھیجے جاتے ہیں اور وہ اسی سرعت کے ساتھ پہونچتے ہیں جسطرح اور معمولی خطوط۔

علاوہ اس کے ہوا سے جھاڑو دینے کا بھی کام لیا جاتا ہے۔ ہوٹلوں، کارخانوں اور بڑے بڑے مکانوں کی صفائی بالعموم اسی طرح ہوتی ہے۔ ہوا کی نالی کا منہ کھول دیا جاتا ہے جس سے نہایت تیز ہوا نکلکر فرش، قالین، میز، کرسی وغیرہ سب کو صاف کر دیتی ہے، یہانتک کہ خاک کا ایک ذرہ بھی باقی نہیں رہتا۔

امریکہ میں، جب ریل کسی سفر سے اپنے مقام پر واپس آتی ہے، تو ایک خاص عمارت کے اندر کھڑی کیجاتی ہے اور وہاں گاڑیوں کے تختے، گدّے وغیرہ سب اسی ہوائے منضغط کے ذریعہ سے صاف کئے جاتے ہیں۔

ریڈیم اور پلونیم اسوقت تک جسقدر معدنی اشیا دریافت ہوئی ہیں، اُنمیں سب سے زیادہ قوی، سب سے زیادہ قیمتی اور سب سے زیادہ عجیب و غریب ریڈیم خیال کیجاتی تھی، جسے پولینڈ کی ایک خاتون نے دریافت کر کے عالمِ ایجاد میں ہلچل ڈالدی ہے۔

ریڈیم، بلوری قسم کا سپید سفوف ہے جسمیں مختلف دھاتیں ملی ہوتی ہیں۔ اسکی قوت تنویر اسقدر زبردست ہے کہ اشعۂ رانتجنی (Rays X) اسکے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

اسکی شعاعیں، سورج کی کرنوں کے برابر تیز دوڑتی ہیں اور تین فٹ موٹے لوہے کے اندر نفوذ کر جاتی

ہیں، یعنی اگر آپ چاہیں تو ریڈیم کی مدد سے نہایت ٹھوس صندوقوں کے اندر کی چیزوں کو جلا کر خاکستر کرسکتے ہیں۔

پروفیسر کیوری (اس خاتون کا شوہر) کہتا ہے کہ اگر کسی کمرے میں دو پونڈ ریڈیم موجود ہو، تو وہ کبھی اسکے اندر جانے کی جرأت نہ کریگا، کیونکہ اسکی شعاعیں نہ صرف آنکھوں کی بینائی سلب کرلیں گی بلکہ سارے جسم کو خاک کا ڈھیر بنا دیں گی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جسقدر ریڈیم دُنیا میں اسوقت تک فراہم ہو چکا ہے، اگر اسکا وزن کیا جائے، تو اسکی مقدار زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ پونڈ ہوگی، لیکن اسی قلیل مقدار میں اتنی قوت پنہاں ہے کہ اگر اُس سے کام لیا جائے تو سارا کرۂ ارض اپنے محور سے ہٹ جائے اور تمام نظام عالم چند سکنڈ میں درہم برہم ہو جائے۔

ریڈیم کے اندر سے جو مادی ذرات نکلتے رہتے ہیں اُنکی رفتار کا اندازہ ۱۲ لاکھ میل فی سکنڈ کیا گیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت کس قدر حیرتناک ہے کہ اجزائے ریڈیم بہت کم فنا ہوتے ہیں یہانتک کہ اگر اسکے ایک مربع انچ ٹکڑے کو یونہی چھوڑ دیا جائے تو وہ دس لاکھ سال تک برابر منور رہے گا۔

ولیم ہیمر نے، جو نیویارک کا برقی انجینیر تھا، ریڈیم کی مدد سے بہت سی تصویریں لی تھیں۔ انمیں ایک تصویر اُس چوہے کی بھی تھی، جو نہایت دبیز صندوق کے اندر کئی کمبلوں میں لپیٹ کر رکھدیا گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ریڈیم کی قوت نفوذ کس حد تک بڑھی ہوئی ہے۔

ریڈیم سے زمانہ آیندہ میں کیا کیا کام لئے جائیں گے، اسکا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت تک جو کام اس سے لئے گئے ہیں، اُن میں بہترین، سرطان کا علاج اور کھوئی ہوئی بصارت کا واپس لے آنا ہے۔

چونکہ ریڈیم، نہایت کمیاب چیز ہے، اسلئے عام تجارت یا صنعت و حرفت کی دُنیا میں اسکا ترقی پانا دشوار نظر آتا ہے، تاہم یہ ممکن ہے کہ کسی وقت روشنی کا انحصار بالکل ریڈیم پر ہو جائے، کیونکہ اس کا ایک ذرہ بھی متعدد کمروں کو ایک صدی تک مسلسل روشنی دے سکتا ہے۔

اسکی قوت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک رتی ریڈیم اگر کسی کے پاس ہو تو وہ پانچسو ٹن وزن کو ایک میل کی بلندی تک اُٹھا سکتا ہے، یعنی صرف ایک اونس ریڈیم پچاس گھوڑوں کی قوت سے، ایک انجن کو بحساب ۳۰ میل فی گھنٹہ، سارے کرۂ ارض کا طواف کرا سکتا ہے۔ اور برطانیہ و

فرانس کے تمام جہازوں کو چشم زدن میں سطح آب سے اٹھا کر خشکی میں پھینک سکتا ہے۔
ریڈیم کے متعلق جدید تجربات کے سلسلے میں ایک بات نہایت عجیب و غریب یہ معلوم ہوئی ہے کہ معمولی یعنی معمولی دھات بھی نہایت آسانی سے قیمتی دھات میں تبدیل ہو سکتی ہے اور دوسری یہ کہ ایک قسم کا ریڈیم مٹی کے تیل سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

دنیا، ریڈیم ہی کے خواص معلوم کرکے متحیر تھی، کہ اسی خاتون نے اک اور زیادہ عجیب و غریب چیز دریافت کرکے حیرت و استعجاب میں غیر معمولی اضافہ کر دیا۔ اس عنصر کا نام اسنے اپنے وطن کی رعایت سے پولونیم رکھا ہے۔

اس کی قوتِ تنویر ریڈیم سے کہیں زاید ہے اور سب سے زیادہ خوبی یہ ہے کہ اسکے اجزار فنا نہیں ہوتے۔

رال کی قسم سے ایک معدنی چیز بوہیمیا میں پائی جاتی ہے اور پولونیم اسی سے نکلتا ہے۔ اس سے قبل یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ معدنی چیز یورینیم نکالنے کے بعد (جو شیشے اور چینی کے برتنوں کو نارنجی رنگ دینے میں استعمال کیا جاتا ہے) بیکار ہو جاتی ہے، لیکن پولونیم کے وجود نے ثابت کر دیا کہ کائنات میں حقیر سی حقیر چیز بھی بیکار و غیر مفید نہیں۔ بیکار تو صرف ہمارا دماغ ہے جو خواص اشیار و حقایق موجودات کے لحاظ سے نہایت تنگ ادراک کا مالک ہے۔

اس وقت تک پوری طور پر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ پولونیم دنیائے سائنس میں کیا کیا انقلاب پیدا کرنے والا ہے، تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ بہت جلد اشعۂ رانتجنی کی جگہ لے لیگا۔ مگر چونکہ یہ نہایت قیمتی چیز ہے (یعنی ایک پونڈ پولونیم کی قیمت کا اندازہ کم از کم پچیس لاکھ کیا جاتا ہے) اسلئے سوائے تجربہ گاہوں کے مشکل سے کسی دوسری جگہ نظر آسکتی ہے۔

ضروری گذارش: اڈیٹر اور منیجر کے مختلف پتوں کا خط و کتابت کے وقت لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

یارانِ نجد

(بزمِ نگار کے لئے)

دہلی کے "کاشانۂ حسین" سے نگار کی آواز، صدائے بازگشت پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ اِسے کہتے ہیں "آستانِ ناز کی بلندی اور جبینِ نیاز کی نارسائی"

لیکن مایوسی کی اِن پر لذت تاویلوں میں کبھی کبھی یہ خیال ضرور بیتاب کر دیتا ہے کہ کہیں یہ سارا "منظرِ خموشی" کوئی "اضافی" و "انعطافی" حیثیت نہ رکھتا ہو۔ اگر یہ واقعہ ہے تو ہم سب کو اعترافِ ہزیمت ابھی سے کرلینا چاہیئے کیونکہ پھر اس جنگ کا سررشتہ اُس کے ہاتھ میں ہے، جسکے مقابلہ میں آنا، تو یونانِ قدیم کے اُس ہیرو کے بھی اقتدار میں نہیں، جو، ہر رات اِک نئی ہیروئن کو اپنی محبت کا یقین دلاکر، طلوعِ سحر سے قبل مسکراتا ہوا اسٹیج سے باہر نکل جایا کرتا تھا۔

مرحوم مہدی حسن، خدا جانے کیوں اپنے کو اخادی لکھا کرتے تھے۔ بہرحال چونکہ اُن کی جگہ پُر کرنا ضروری ہے اسلئے میں مسٹر عبدالرؤف بی، اے، ال ال بی کو پیش کرتا ہوں، جو کوپن میں بھی کم از کم بیس سطریں لکھکر منی آرڈر فارم کا کوئی حصہ بیکار نہیں جانے دیتے۔

ہرچند وہ ازراہِ انکسار، اسکی ایک منطقی وجہ یہ پیش کرینگے کہ منی آرڈر کا پہونچنا یقینی ہے اور لفافہ یا کارڈ کا گم ہوجانا محتمل، تاہم ہمیں "حق بہ حقدار" کے اصول کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

بزمِ نگار کے تمام احباب معلوم کرلیں، کرّوبیانِ ملاءِ اعلیٰ، اپنے اپنے صحائف میں لکھ لیں کہ اکبر آباد کے قطب نے ۲ رمارچ کو اپنی جگہ سے جنبش کی اور اجمیر تک پہونچکر پھر حرکت بالارادہ کی صفت سے انتزاع اختیار کرلیا۔ لیکن باعثِ مسرت امر یہ ہے کہ آئندہ صدی تک مراجعت ہوجائیگی اور وہاں زیادہ قیام نہیں ہوگا۔

آپ نے نگار پر ریویو کیا، موجودہ ادبیات سے بحث کی، اپنی کیفیاتِ قلبی سے مطلع فرمایا، مجھے حیاتِ خضر ملنے کی دعا دی، لیکن ذکر نہیں کیا تو یارانِ نجد کا۔ گویا اِس سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ "ہمیں اس سے کیا واسطہ" حالانکہ بعض صور توں میں سکوت بھی بدترین "رسوائی" ہوجاتا ہے خلیقی صاحب، مجھے تو اِس باب میں آپکی یہ خاموشی، واللہ بہت لطف دیگئی۔

نیاز

انتقاد

جہاں آرا بیگم | مولفہ ضیاؤ الدین احمد برنی، بی اے ضخامت ۴۸ صفحات تقطیع ۱۸×۲۲/۱۶ قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ عبدالقدیر و الاخوان، چھتہ لال میاں، دہلی۔

اس کتاب میں دولتِ مغلیہ کے مشہور تاجدار شاہ جہاں کی محبوب بیٹی جہاں آرا بیگم کے حالات مورخانہ کاوش کے ساتھ یکجا کئے گئے ہیں۔ برنی صاحب (جو باوجود وابستۂ پنجاب ہونیکے خدا معلوم کیوں اپنے کو برن یا بلند شہر سے منسوب کرتے ہیں) نہایت سُلجھی ہوئی عبارت لکھتے ہیں جو تاریخی تصانیف کیلئے ازبس ضروری ہے۔

اُردو لٹریچر ممنون ہے کہ انھوں نے اس تالیف سے مواد تاریخی میں قابل قدر اضافہ کیا، البتہ جہاں اس خاتون کے "کیرکٹر" پر روشنی ڈالی گئی ہے، وہاں مغربی مورخین کی نکتہ چینیوں کو صاف طور پر لکھکر انہیں رفع کرنا چاہئیے تھا، اس طرح دبی زبان سے اک سرسری بیان پر اکتفا کرنا، خود اپنی کمزوری کو ظاہر کرنا ہے۔ امید ہے کہ برنی صاحب دوسرے اڈیشن میں اس نقص کو دور کردیں گے۔ بہرحال کتاب عمدہ، دلچسپ اور برمحل ہے۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اسکے مطالعہ سے خوش ہوں گے۔

عبرت | از سرتاپا تاریخی رسالہ ہے، جو ہر ماہ زیر ادارت مولوی اکبر شاہ خاں نجیب آباد سے شائع ہوتا ہے۔ چوتھی جلد کا تیسرا نمبر ہمیں تبادلہ میں موصول ہوا ہے۔ اسمیں ملابار پر جو مضمون لکھا گیا ہے اس سے قابل اڈیٹر کے تاریخی ذوق پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ مضامین غیر میں بھی بعض مقالات تاریخی مفید و دلچسپ ہیں ہندوستان میں عبرت ہی اک ایسا رسالہ ہے جسنے اپنا نصب العین صرف تاریخ کی خدمت قرار دیا ہے اور اسلئے قابل قدر ہے ضخامت ۴۸ صفحات، تقطیع ۲۰×۲۶ قیمت پانچ روپیہ سالانہ

حریت | ہفتہ وار اخبار ہے جو لاہور سے ۱۸×۲۲/۸ کے ۲۰ صفحات پر شائع ہوتا ہے۔ اسوقت تک اسکے دو پرچے شائع ہو چکے ہیں جنمیں سیاست حاضرہ پر آزادی سے رائے زنی کیگئی ہے اور تنوعِ مضامین سے کافی سامانِ دلچسپی فراہم کیا گیا ہے۔ علاوہ کارٹون کے ہر ہفتہ اک ہاف ٹون تصویر بھی بالالتزام شائع کیجاتی ہے قیمت رشے سالانہ) زاید نہیں معلوم ہوتی۔

نقاش | اڈیٹر۔ یوسف عزیز بدایونی، حجم ۴۸ صفحات قیمت للعہ تقطیع ۲۰×۲۶ طباعت و کتابت پسندیدہ۔

ماہوار رسالہ ہے جو جنوری ۲۳ سنہ سے جاری کیا گیا ہے، پہلا پرچہ صرف ۳۲ صفحات کا تھا اور مضامین کے لحاظ سے بھی گرا ہوا تھا، لیکن دوسرے نمبر میں ۱۶ صفحات کا اضافہ کرکے زیادتی قیمت کی کچھ تلافی کیگئی ہے۔ اس نمبر میں کل ۵ مضامین ہیں جنمیں سے تین "باقی آیندہ" کی کشاکش میں مبتلا ہیں۔ اگر رسالہ کی ضخامت نہیں بڑھائی جاسکتی تو مضامین مختصر

درج کرانے چاہئیں اسمیں مجوی صاحب کا افسانہ "روحی فداک" اک عربی ناول کا ترجمہ ہے لیکن اسکو ظاہر نہیں کیا گیا۔
سب سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ اسمیں تمام غزلیات و مضامین حضرات بھوپال کے نتائج افکار ہیں، جو حسنِ اتفاق کی عجیب و غریب مثال ہے۔

علیگڈھ میگزین | اسوقت اردو کے جتنے رسایل شایع ہوتے ہیں، اُن سب میں یہی اک ایسا رسالہ ہے، جو دماغی خستگی کے بعد صحیح معنی میں اسباب تفریح فراہم کرنیکا مدعی ہو سکتا ہے۔ کم از کم میں تو اُس کیلئے اسقدر بیتاب رہتا ہوں کہ جب اسکی اشاعت میں دیر ہو جاتی ہے (اور اکثر ہوتی ہے) تو میں رشید صاحب سے تقاضا شروع کر دیتا ہوں۔
رشید صاحب صدیقی (ایم۔ اے) (جو ہماری بدقسمتی سے اب پروفیسر بھی ہو گئے ہیں) جس انداز کے لکھنے والے ہیں، اسکی تقلید رنگِ ٹگور کیطرح ممکن نہیں، اور فطرت بہت کم دماغوں کو اپنی اس نوع کی ظریفانہ فیاضی سے کچھ ودیعت کرتی ہے۔ ظریفانہ مضامین اکثر عامیانہ اور سوقیانہ رنگ میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس رنگ کے ساتھ ساتھ اپنی خودداری کو قایم رکھ سکیں، لیکن رشید صاحب کا کوئی مضمون ایسا نہیں ہوتا جو حد درجہ مضحک ہونیکے ساتھ ہی، تہذیب و خودداری کے حدود سے متجاوز نظر آتا ہو۔
باوجود اسکے کہ میگزین کے متعلق، اڈیٹر اور منیجر سے لیکر محرر و چپراسی تک کی تمام خدمات ہمارے پروفیسر اڈیٹر کو تن تنہا انجام دینی پڑتی ہیں، لیکن پھر بھی وہ شغف جو اُنہیں اردو لٹریچر سے ہے اطمینان سے بیٹھنے نہیں دیتا اور کسی نہ کسی طرح وہ رسالہ کی اشاعت کر ہی دیتے ہیں اور اس شان کیساتھ کہ مشکل سے کوئی اور رسالہ بروے کار آسکتا ہے۔
علاوہ فاضل اڈیٹر کے اور جتنے مضامین نگار اس رسالہ کو دستیاب ہوئے ہیں وہ بھی اچھا ذوق ادب رکھتے ہیں اور اگر کبھی اُنکا مقصود یہ نہیں ہوتا کہ رشید صاحب کے تقاضوں سے صرف نجات حاصل کر لیجائے، تو خوب لکھتے ہیں۔
جنوری نمبر ہمارے پیش نظر ہے، جسمیں سوائے ایک مضمون کے جو ٹیگور کی تقلید میں لکھا گیا ہے، سب دلچسپی سے پڑھے جانیکے قابل ہیں۔ رشید صاحب کا کارکو، حسن خورشید صاحب کا محلسرا، ادبِ لطیف کے نہایت پاکیزہ نمونے ہیں اور شبلی نعمانی کے عنوان سے احتفاد حسین صاحب کا مضمون، میر انیس کی شاعری پر جناب کلیم کا مقالہ، تنقیدِ عالیہ کی روشن مثالیں ہیں۔ لیکن اسکے ساتھ اگر کوئی عیب ہے تو یہ کہ

"خالِ مہر و وفا نیست روے زیبا را"

یعنی جنوری نمبر مارچ میں شایع ہوتا ہے۔

اڈیٹر سے مراسلت بھوپال کے پتہ سے ہونی چاہیئے اور ارسال زر، درخواست خریداری آگرہ کے پتہ سے۔

مژدہ
ایک نظر ادھر بھی

مژدہ
ایک نظر ادھر بھی

صاحبان

سرکاری ملٹری محکمہ جات و گورنمنٹ اسکولوں و کالجوں و کلبوں و ریاستوں و لمیٹڈ فرموں۔ و دیگر بڑے بڑے مشہور سوداگروں کو اعلیٰ ترین سامان متعلقہ سپورٹس یعنی کرکٹ۔ ہاکی۔ فٹ بال۔ ٹینس بیڈمنٹن۔ پولو وغیرہ بغیر وی۔ پی کے کھلے طور پر ارسال کیا جاتا ہے۔ اور قیمت بعد ازاں پسند آنے پر وصول کیجاتی ہے۔ نیز ہم یہ گارنٹی بھی کرتے ہیں۔ جو مال پسند نہ آوے۔ وہ فوراً بغیر استعمال کئے واپس کر دیجئے گا۔ اور دام واپس لے لیجئے گا۔ اس صورتمیں تمام اخراجات کرایہ آمد و رفت پیکنگ وغیرہ ہم اپنی گرہ سے دیں گے۔ اس سے بڑھ کر آپ کی تسلی صرف مال کے خریدنے سے ہو سکتی ہے۔ آزمایش شرط ہے۔ مکمل باتصویر فہرستیں مفت ارسال کیجاتی ہیں۔

المشتہر

ای۔ کیپر۔ اینڈ کو سپورٹس مینوفیکچرز۔ سیالکوٹ سٹی

تار کا پتہ:۔ کیپر کو۔ سیالکوٹ سٹی۔

دائرہ سیاسیات مشرقیہ

یہ ایک دارالاشاعت ہے جو دہلی میں، اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ بالعموم ایشیا اور مخصوص دُنیائے اسلام کے متعلق سیاسیات پر بہترین اور اعلیٰ معیار کا لٹریچر فراہم کرے مصنفین و مولفین سے درخواست ہے کہ دائرہ سے خط و کتابت کریں۔ دائرہ ہر ایسی تصنیف و تالیف کیلئے بہترین معاوضہ دینے پر طیار ہے کتب ذیل شائع ہو چکی ہیں، ذیل کے پتہ سے طلب فرمائیں:۔ سمرنا میں یونانی مظالم قیمت عہ، حوادث سمرنا قیمت ۲ر

منیجر دائرہ سیاسیات مشرقیہ۔ کوچہ پنڈت، دہلی

"اعتماد ہر قیمت پر ارزاں ہے"

اسلئے ہمنے تہیہ کیا ہے کہ اس جنس گرانمایہ کو ارزاں کر دیں، لہٰذا اگر آپکو سامان چرمی مثلاً ٹرنک، سوٹ کیس، ہینڈ بیگ، ہولڈ آل، بوٹ اور شوز (زنانہ و مردانہ) اور بیلٹ وغیرہ درکار ہوں اور قابل اعتماد اور مناسب داموں پر حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنی ضروریات کیلئے ذیل کے پتہ پر خط و کتابت کیجئے۔ (مصور فہرست مرتب ہو رہی ہے جو مفت حاضر خدمت کی جائیگی)

لطیف اینڈ کمپنی رمن ٹولہ آگرہ

دی سن موُن شو فیکٹری

ہر قسم کے بوٹ اور شوز زنانہ و مردانہ خالص اور بہترین چمڑے کے طیار کئے جاتے ہیں مضبوطی و خوبصورتی کسیطرح ولایتی مال سے کم نہیں۔ علاوہ ازیں ہر فیکٹری سے نسبتاً مال ارزاں ملیگا۔ آپکو صرف ایک آرڈر دینے پر ہماری اس تحریر کی صداقت معلوم ہو جائے گی۔ زیادہ لکھنا فضول ہے۔ (وہاب الدین ظفر الدین، لیدر مرچنٹ ڈھولی کھار آگرہ

عدم تعاون

کے باوجود بھی گھڑیاں خریدنا منع نہیں ورنہ ہندوستان میں کارخانہ تھوڑے ہیں لاکھوں گھڑی ساز بیکار ہو جاوینگے ہمسے ارزاں اور مضبوط گھڑیاں طلب کریں ریلوے رگیولیٹر گارنٹی ۵ سال قیمت للعہ امریکن لیور سنہری نقشی ساختہ ویسٹرن کلاک کمپنی گارنٹی دس سال قیمت سات روپیہ خلافت واچ معہ درود شریف گارنٹی سات سال قیمت پانچروپیہ رسٹ واچ جیوا معہ تسمہ پانچروپیہ لیور گارنٹی سات سال قیمت سات روپے لیور جویلدار گارنٹی ۲۰ سال قیمت دس روپیہ اندھیرے میں وقت دینے والی تیرہ روپیہ۔

نیو برادرز کمپنی صدر بازار دہلی

گورنمنٹ سے قطع تعلق

کا ریزولیوشن چونکہ پاس ہو گیا ہے۔ اسلئے باعزت روزگار کی تلاش ہے تو فوراً ہومیوپیتھک ڈاکٹری کی تعلیم بذریعہ خط و کتابت حاصل کریں جسکو دُنیا کے ماہرین نے بیفیر اور زود اثر مانا ہے۔ کامیاب طلباء کو کلکتہ سے ڈپلومہ عطا ہوگا۔ داخلہ فیس عار فیس عہ ماہوار غریبوں کو تعلیم مفت۔ رکا گمنٹ آنا چاہیئے ہر قسم کے سوتی ریشمی اونی پارچہ بافی صابن سازی موٹر ڈرائیوری بھی سیکھ سکتے ہو داخلہ معاف اپنا پتہ صاف خوشخط ہو۔

المشتہر:۔ بزم تجارت دہلی!

حافظ امام الدین پبلشر نگار نے باہتمام خواجہ صدیق حسین مطبع آگرہ اخبار میں چھپوا کر شائع کیا